كُونُوا مَعَ الصَّادِقِين

سچوں کے ساتھ ہو جاؤ

حضرت مولانا
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

حضرت مولانا
قاری محمد طیبؒ

حضرت مولانا
عبدالحق مدنیؒ

حضرت مولانا
سعید احمد خانؒ

حضرت مولانا
یوسف دہلوی نقشبندیؒ

حضرت مولانا
صوفی محمد احمدؒ

حضرت مولانا
مفتی محمد شفیع صاحبؒ

جناب امان اللہ اسماعیل میمن

میمن اسلامک پبلشرز

سچّوں کے ساتھ ہو جاؤ

بھائی امان اللہ اسماعیل میمن

تقریظ

مولانا مفتی محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تصنیف	←	امان اللہ اسماعیل میمن
تقریظ	←	محمد عبداللہ میمن صاحب
اشاعت اول	←	جنوری ۱۹۹۸ء
تعداد	←	ایک ہزار
ناشر	←	میمن اسلامک پبلشرز، فون: ۔ ۴۹۱۶۰۳۳
باہتمام	←	ولی اللہ میمن
قیمت	←	/= روپے

ملنے کے پتے

- میمن اسلامک پبلشرز، ۱۸۸/ا۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹
- دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی
- ادارہ اسلامیات، ۱۹۰۔ انار کلی، لاہور ۲
- مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴
- ادارۃ المعارف، دارالعلوم کراچی ۱۴
- کتب خانہ مظہری، گلشن اقبال، کراچی
- مولانا اقبال نعمانی صاحب، آفیسر کالونی گارڈن، کراچی

فاروق اعظم کمپیوٹرز

تقریظ

مولانا مفتی عبداللہ میمن صاحب

استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد ربّ العالمين ، والعاقبة للمتقين،
والصلاة والسلام على رسوله الكريم،
وعلى كل من تبعهم باحسان الى يوم الدين
أمابعد :

ہر انسان فطرتاً اپنے گرد و پیش کے ماحول سے اور دوسرے انسانوں کی صحبت سے متاثر ہوتا ہے، اسی وجہ سے اللہ جل شانہ نے قرآن کریم میں ایمان والوں کو اچھی صحبت اختیار کرنے کا بطور خاص حکم فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ۔

(التوبہ:۱۹۹)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچوں کے ساتھ رہو۔

اس آیت میں مسلمانوں کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا، اور پھر اس تقویٰ کو حاصل کرنے کی تدبیر یہ بتائی کہ صالحین اور صادقین کی صحبت اختیار کرو۔ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صالح اور اچھے ہمنشین کی مثال اس شخص کی سی ہے جو مشک والا ہو،، اگر اس سے مشک نہ بھی ملے تب بھی اس کو خوشبو پہنچے گی، اور برے ہمنشین کی مثال اس شخص کی سی ہے جو بھٹی دھونکنے والا ہے۔ اگر کوئی چنگاری آکر لگ گئی تو بدن یا کپڑے جلا دے گی، اور اگر چنگاری اڑ کر نہ لگی تو دھواں اور گرمی تو پہنچے گی۔ بقول شخصے:

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالع ترا طالح کند

یعنی نیک آدمی کی صحبت تجھے نیک بنا دے گی، برے کی صحبت تجھے برا بنا دے گی۔

کامل کی صحبت میں بعض اوقات کامیابی کا کوئی گر ہاتھ آ جاتا ہے،

یا کوئی ایسی حالت قلب میں پیدا ہو جاتی ہے جو ساری عمر کے لئے مفتاح سعادت بن جاتی ہے۔

مندرجہ بالا آیت، حدیث پر عمل کرتے ہوئے برادر محترم جناب امان اللہ صاحب نے بچپن ہی سے بڑوں اور نیک لوگوں کی صحبت کو اختیار کیا، مثلاً مولانا محمد یوسف دھلویؒ، صوفی محمد احمد صاحبؒ، مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا سعید احمد خان صاحبؒ، سید ابوالاعلی مودودیؒ، مولانا عبدالحق مدنیؒ، ان بڑے بڑے حضرات کی صحبت سے بہت کچھ حاصل کیا اور ان کے تجربات سے بہت فائدہ اٹھایا، اور خود اپنی زندگی میں انقلاب لائے۔

انہی بزرگوں سے جو حاصل کیا، اس کا کچھ نمونہ اپنی اس کتاب کے ذریعہ قارئین تک پہنچانا چاہتے ہیں، تاکہ جس طرح انہوں نے ان حضرات سے کسب فیض کیا، اسی طرح پڑھنے والے کچھ حاصل کرلیں۔ اور وہ بھی بزرگوں کی صحبت کو غنیمت جانیں، اور ان کے پاس آنا جانا رکھیں، تاکہ وہ بھی ان بزرگوں سے اپنی زندگیوں میں انقلاب لائیں۔

چونکہ برادر موصوف نے جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی صحبت بھی اٹھائی اور ان کے اندر بھی بہت سی اچھی باتیں پائیں، اس لئے ان کی اچھائیوں کا ذکر کر دیا۔ اور چونکہ سید صاحب نے بزرگوں کی صحبت نہیں اٹھائی تھی، اس لئے ان کے اندر جو خامیاں تھیں، ان کا بھی موصوف نے اس کتاب میں تذکرہ کر دیا ہے۔ انصاف کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ

اچھائیاں اور خامیاں دونوں ذکر کر دی جائیں۔ تاکہ قارئین کے سامنے دونوں رخ آ جائیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی اس کتاب کو قبول فرمائے، اور پڑھنے والوں کے لئے نافع مفید بنائے۔ آمین۔

مفتی محمد عبداللہ میمن
دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴
۹ رمئی ۲۰۰۲ء

فہرست مضامین

اہل اللہ کی ضرورت

اہل اللہ کی ضرورت اور اہمیت ایک ناقابل انکار اور مسلمہ حقیقت ہے، کیوں کہ یہی حضرات مصلحین تھے اور آج بھی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان جب اکیلا چلتا ہے اور اس کے سر پر کسی مصلح کا ہاتھ نہیں ہوتا تو وہ ضرور ٹھوکریں کھاتا ہے، خصوصاً جب کہ ایسا کوئی شخص لوگوں کا مقتدا بھی ہو۔ واقعی امام غزالیؒ نے خوب فرمایا کہ "عالِم کی لغزش عالَم کی لغزش ہے" یعنی جب کوئی عالِم لغزش کھاتا ہے تو اس سے پورا عالَم یعنی پوری دنیا لغزش کھا جاتی ہے۔ اسی لئے اللہ ربّ العزت نے قرآن مجید کے ساتھ ساتھ ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مبعوث فرمایا تاکہ کتاب اللہ کی غرض وغایت وہ اپنی امت کو تعلیم کرے، ان کا تزکیہ کرے اور ان کو حکمت کی تعلیم دے۔ اسی غرض کو اس آیت میں مدنظر رکھا گیا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"ہم نے تمہیں میں سے ایک رسول کو مبعوث فرمایا
جو تمہارے سامنے آیات اللہ کی تلاوت کرتا ہے اور
تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب اللہ کی تعلیم دیتا

ہے اور حکمت سکھاتا ہے۔

(سورہ بقرہ آیت ۱۵۱)

مندرجہ بالا چاروں صفات کارِ نبوت میں تو بدرجہ اتم موجود ہی تھیں، لیکن بعد میں بھی اکابرین امت نے اپنی حسبِ استطاعت ان چاروں شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں ماشاء اللہ۔ جس نے تلاوت آیات کا شعبہ اختیار فرمایا وہ امام القراء بنے اور اس شعبہ میں امت کے مقتدا بنے۔ کسی نے کتاب اللہ کی تعلیم کو اپنا محور بنایا تو ماشاء اللہ ایسے بزرگوں نے تفسیرِ قرآن میں اپنا نام پیدا فرمایا اور امت کے سامنے قرآنی علوم کے موتی بکھیر دیئے۔ اسی طرح کسی نے تزکیہ اور حکمت کا شعبہ اختیار فرمایا تو وہ امت کے نامور حکماء وصوفیاء بنے۔ چونکہ اس آخری گروہ کا تعلق تزکیہ نفس اور حکمت سے تھا، اس لئے یہ حضرات ہمیشہ ساری ہی امت کے مقتدا رہے، کیوں کہ نیت کی درستگی اور اصلاح باطن کے بغیر دین اسلام میں کسی عمل کا کوئی وزن ہی نہیں رہ جاتا، اور یہی عظیم کام ان حضرات کے ذمہ تھا۔ ایک مشہور حدیث میں سرکارِ دو عالم ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ

اعمال کا دارومدار نیت ہی پر ہے۔

(بخاری)

اور نیت کی درستگی کا تعلق صرف اور صرف باطنی اصلاح پر ہی منحصر ہے، کیوں کہ یہ ایک باطنی فعل ہے۔ آپ قرآن اور احادیثِ نبویؐ پڑھ جایئے، آپ کو بے شمار ایسی نظیریں اور مثالیں ملیں گی جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے

سے بڑا عمل اگر نیت درست نہ ہوتو رد ہو جاتا ہے اور اگر نیت میں اخلاص اور لِلّٰہیت موجود ہوتو چھوٹے سے چھوٹا عمل احد پہاڑ کے برابر وزن رکھتا ہے۔ ہم پہلے مندرجہ ذیل سطور میں اصلاحِ باطن اور نیت کی درستگی کی اہمیت پر روشنی ڈال رہے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ جب تک باطن کی اصلاح نہ ہو جائے، محض ظاہرداری کا کوئی وزن اسلام کی نگاہ میں نہیں۔

قرآن کریم اور اصلاح باطن

سب سے پہلے ہم قرآن مجید کو لیتے ہیں، سورہ حج میں اللہ تعالیٰ قربانی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

> ہمیں قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا مگر تمہارے دل کا تقویٰ پہنچتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ تقویٰ ایک باطنی فعل ہے، اسی کو اہمیت دی گئی، گو ظاہر مطلوب ضرور ہے مگر اس کی قیمت کا تعین اندر کی نیت پر ہی ہوگا۔

اسی طرح جب روزے کا حکم دیا گیا تو فرمایا کہ:

> روزے تم پر اس لئے فرض کئے گئے تا کہ تمہارے اندر صفت تقویٰ پیدا ہو۔

یہاں بھی فرمایا گیا کہ تمہارے اندر تقویٰ یعنی خدا ترسی اور خوف خدا پیدا ہو، جو ظاہر ہے ایک باطنی صفت ہے۔ اس لئے ایک حدیث میں ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص روزہ تو رکھے مگر غیبت، چغلی اور جھوٹ وغیرہ

سے نہ بچے تو اللہ کو ایسے روزے کی کوئی ضرورت نہیں ۔گویا ظاہر میں اسکے بھوکے رہنے کی کوئی حیثیت نہیں، گو روزہ مطلوب ہے مگر مقصود اس سے تقویٰ کی صفت ہی ہے۔

اسی طرح نماز کے بارے میں فرمایا کہ:

وہ مؤمن لوگ کامیاب ہوگئے جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع اختیار کرتے ہیں۔

(سورہ مؤمنون)

یعنی ظاہری نماز جب ہی وزن دار ہوگی جب وہ باطنی طور پر بھی ایسی ہو۔

اسی طرح زکوٰۃ میں اگر ریاکاری ہو اور دل میں اخلاص نہ ہو تو اسکی بھی کوئی قیمت نہیں ۔اسکی مثال قرآن مجید نے اس طرح بیان فرمائی ہے کہ:

ان کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کی بارش برس کر اسے صاف کردے ۔ یہ ریاکار لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی بدلہ حاصل نہیں کرسکیں گے اور خدا ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

(سورہ بقرہ آیت ۲۶۴)

اسی طرح حجِ بیت اللہ کا معاملہ ہے کہ جس کا باطن حرام مال سے پاک ہو اور حج میں فسق و فجور سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے تو اس کی حج صحیح معنوں میں حج ہے۔

آپ قرآن مجید میں یہ آیت بھی پڑھتے ہیں کہ جب شیطان راندہ درگاہ ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ یا الٰہی میں تیرے بندوں کو ہر چار طرف سے گمراہ کرونگا۔ اس وقت بھی اللہ رب العزت فرماتا ہے کہ

تو میرے مخلص بندوں کو ہرگز بہکا نہیں سکے گا۔

اب آپ غور کریں کہ یہ اخلاص ہی تو سب سے بڑی دولت ہے جس کے ہوتے ہوئے شیطان کا وار تک نہیں چل سکے گا اور ایسا اخلاص باطنی اصلاح کے بغیر ممکن ہی نہیں جو کسی مصلح کی صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

احادیث اور اصلاح باطن

اس کے بعد آپ احادیث کی طرف آئیں، وہاں بھی آپ کو باطنی پاکیزگی ہی کی قیمت نظر آئیگی۔ ایک مشہور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین شخصوں کا ذکر فرمایا ہے، جس میں ایک شہید کا ذکر ہے جو قیامت میں اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوگا، مگر اس کی شہادت اس لئے قبولیت نہیں پاسکے گی کہ اس نے وہ کام اپنی شہرت کے لئے کیا ہوگا کہ لوگ اسے مجاہد کہیں۔ پھر ایک سخی پیش ہوگا جس نے بڑی خیرات کی ہوگی، مگر چونکہ اس کی نیت میں کھوٹ ہوگی کہ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اسے سخی کہیں، اس لئے اس کا عمل بھی رد کردیا جائے گا، حالانکہ اس کا ظاہری عمل اچھا تھا۔

اسی طرح ایک عالم پیش ہوگا، مگر اس کی ساری علمی تگ و دو اس لئے رد کردی جائیگی کہ اس کی نیت میں کھوٹ ہوگی، وہ چاہتا تھا کہ لوگ اسے

عالم کہیں، سو لوگ اسے کہہ چکے، اب اس کے لئے کوئی ثواب نہیں۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی مثالیں آپ کو احادیث میں ملیں گی۔

دوسری طرف آپ کو ایسی مثالیں بھی نظر آئیں گی جس میں اخلاص کی وجہ سے چھوٹا عمل احد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوگوں نے اپنے صدقات جمع کئے۔ ایسے میں ایک صحابی آتے ہیں جن کے پاس کچھ پہلے سے تھا نہیں، مگر پچھلی ساری رات انھوں نے ایک یہودی کے کنویں کو کھینچا تھا جس کی اجرت میں ان کو کچھ کھجوریں ملی تھیں، وہ انھوں نے اپنے حصّہ کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صدقہ میں دے دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کھجوروں کو پورے صدقات کے ڈھیر پر رکھ دیا اور اس کے اخلاص کی قدر فرمائی۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تک انسان کی اندر کی دنیا نہیں بدل جاتی، کچھ بات بنتی ہی نہیں۔ جس طرح کچھ ظاہری اعمال ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ اور کچھ ظاہری گناہ ہیں جیسے چوری، زِنا، قتل وغیرہ، اسی طرح کچھ باطنی اعمال بھی ہیں جیسے صبر، شکر، تقویٰ، توکل، یقین وغیرہ اور کچھ باطنی گناہ بھی ہیں جیسے غیبت، حسد، کینہ، بغض، لالچ، بخل اور رِیا وغیرہ۔

اب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب تک روح سے باطنی گندگی دور نہیں ہو جاتی، اس وقت تک نہ ظاہری اعمال میں وہ جان پیدا ہو سکتی ہے جو شریعت کو مطلوب ہے، نہ وہ ظاہری گناہ چھوٹ سکتے ہیں جو شریعت چھُڑانا

چاہتی ہے اور نہ ہی باطنی صفات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ باطنی صفات پیدا ہوں تو کیسے پیدا ہوں؟ بس اسی کا جواب ہماری یہ کتاب ہے۔ ہم نے اس کتاب میں ان مصلحین کا ذکر کیا ہے جن کی اپنی اصلاح ان کے پیش رووں نے کی تھی اور بعد میں وہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آگے نکل گئے۔

اس میں شک نہیں کہ ظاہری گناہ جن کا کچھ ذکر ہم نے مندرجہ بالا سُطور میں کیا ہے، شریعت نے ان کے لئے سزائیں مقرر فرمائی ہیں، تاکہ اس سزا کے خوف سے لوگ ان گناہوں کے قریب نہ پھٹکیں۔ اس طرح کچھ ظاہری اعمال ہیں جن کو ادا نہ کرنے کی صورت میں بھی شرعی سزائیں ہیں، مثلاً بے نمازی کے لئے قید و بند اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے پر سختی۔ اسی طرح قاتل سے قصاص اور چور کا ہاتھ کاٹنا وغیرہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سزاوں میں شریعت کی عظیم مصلحت پوشیدہ ہے، کیوں کہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں جو کسی طرح رام نہیں ہوتے، ان کا علاج صرف اور صرف سزا ہے، مگر عامۃ الناس ہمیشہ ترغیب و ترہیب سے رام ہوجاتے ہیں۔ اس لئے شریعت الٰہی نے اپنے رسولوں کے ذمہ تزکیہ نفس کی ذمہ داری لگادی۔ یہی تو وہ تزکیہ و حکمت تھی جس کو کام میں لاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ میں ایک لاکھ چوبیس ہزار نفوس کی ایسی تربیت فرمائی اور ایسے نفوس تیار فرمائے کہ زمین و آسمان نے اس سے پہلے نہ ایسے پاکیزہ نفوس دیکھے تھے نہ آئندہ اس کا کوئی امکان ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ امت

کے جن حضرات نے تزکیہ نفس کا کام اپنے ذمہ لیا، وہ لوگ یقیناً اوروں سے فائق تھے، کیوں کہ ان کی صحبت اختیار کیے بغیر رذائلِ اخلاق کا زائل ہونا اور عمدہ صفات کا پیدا ہونا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے کسی کو نواز دے یہ اور بات ہے، عام قائدہ یہ ہرگز نہیں۔

اسی بات کو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ:

اے ایمان والوں! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایمان بھی ہے، تقویٰ بھی ہے، مگر پھر بھی ان سے کہا جارہا ہے کہ سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ یعنی اپنا ماحول بدلو اور ایسے مصلحین کی صحبت میں جاکر بیٹھو جو تمہارے رذائل کو مٹا دیں اور تمہارے اندر وہ صفات پیدا کردیں کہ تمہارا ہر عمل خالص لِلّٰہیت کے جذبہ سے ہو۔ گو یا کہ تم اس آیت کی عملی شکل بن جاؤ کہ ''میری نماز، میری قربانی حتیٰ کہ میری پوری حیات اور ممات صرف اللہ رب العالمین کے لئے ہو جائے''۔

اسی غرض و غایت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ کتاب لکھی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ پروردگار اسے نافع بنائے اور میرے لئے اور میرے والدین کے لئے توشہ آخرت بنائے۔ آمین۔

امان اللہ اسماعیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہجرت

یہ غالباً ۱۹۴۷ء کے اواخر کا واقعہ ہے جب ہندوستان تقسیم ہو رہا تھا، میری عمر اس وقت سات سال کی تھی، والد محترم کا انتقال ہو چکا تھا اور بڑے بھائی محمد یوسف بانٹوا کاٹھیاواڑ سے دور بمبئی کی طرف سروس میں تھے، رات کے کوئی دس بجے کا وقت تھا، گھر میں میری محترم والدہ اور ایک بڑا بھائی عبدالعزیز، امینہ بائی، میں امان اللہ اور چھوٹی بہن زیب النساء موجود تھے، ہم لوگ ایک فلیٹ میں رہتے تھے، اچانک بلڈنگ میں شور اٹھا کہ ہندو اور سکھ مل کر بلڈنگ لوٹنے کے لئے آ گئے ہیں اور بلڈنگ کا مین گیٹ کلہاڑیوں سے توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آخر ایک آدھ گھنٹے کے بعد وہ بلڈنگ میں گھس آئے اور لوٹ مار شروع کر دی، ہماری والدہ بہت عابدہ زاہدہ تھیں، وہ مصلی پر بیٹھ گئیں اور اللہ تعالیٰ سے آہ وزاری کرنے لگیں کہ اے ربّ کریم! میں بیوہ ہوں اور میرے بچے یتیم ہیں، تو ان ظالموں سے حفاظت فرما۔ الحمدللہ! اس دعا کا نتیجہ یہ ہوا ہمارا گھر لٹنے سے بچا رہا اور وہ لوگ کچھ لوگوں کو لوٹ کر واپس چلے گئے۔ صبح دوسرے رشتہ داروں کے حالات معلوم

ہوئے کچھ اُٹ گئے تھے کچھ بچ گئے تھے۔

بہر حال سب نے مل کر طے کیا کہ یہاں رہنا بیکار ہے پاکستان ہجرت کر جاتے ہیں۔ والدہ محترمہ نے بادل ناخواستہ اپنا سامان باندھا، گھر میں ایک دادا کے زمانے کی تجوری تھی، اس میں اپنا قیمتی زیور رکھا اور اس کو تالا لگا کر چابی اپنے پاس رکھ لی۔ ہم نے پوچھا ماں! ہم اپنا گھر بار، گلی محلّہ اور زیور تک چھوڑ کر یہاں سے کیوں جا رہے ہیں؟ والدہ نے بڑے جذبات اور دل سوزی سے جواب دیا کہ میرے بچوں! ہم پاکستان جا رہے ہیں جہاں قرآن وسنت کا نظام ہوگا، امن وامان ہوگا، عدل وانصاف ہوگا، خلفاءِ راشدِین کی طرز کی حکومت ہوگی، اور جو کچھ ہم چھوڑ رہے ہیں اس سے بہت بہتر زندگی ملے گی۔ کبھی کبھی وہ کہتیں کہ ہم جہنم سے جنت کی طرف جا رہے ہیں اور ہم آخر کار اُس جنت کا تصوّر لے کہ والدہ کے ساتھ عازم پاکستان ہوئے۔

کیا پاکستان لاکھوں مہاجروں کے خوابوں کی تعبیر بنا؟

میری محترم والدہ کی طرح لاکھوں انسان اس امّید پر پاکستان آئے کہ پاکستان ایک جدید اسلامی ریاست کے ساتھ ساتھ ایک فلاحی ریاست بنے گا جس میں عدل وانصاف کا بول بالا ہوگا، سب کو برابر ترقّی کے مواقع ملیں گے، امیر وغریب کا فرق مٹا دیا جائے گا، مگر جو کچھ ہوا وہ یہ ہوا کہ قائداعظم کے انتقال کے بعد طالع آزماؤں نے اس ملک کو یرغمال بنا لیا،

اس ملک کو منظم طریقے سے لوٹا گیا، اس ملک میں عصبیتوں کو ابھارا گیا، تنگ نظر مولویوں نے مسلمانوں کو فرقہ پرستی کے دلدل میں اتار دیا، جو لوگ کل تک ایک قالب اور ایک جان تھے، وہ ایک دوسرے کی جان کے دُشمن ہوگئے۔ غریب مزید غریب اور امیر مزید امیر ہوتا گیا، غریبوں کے لئے تعلیم کے دروازے بند اور امیر کے بچے ائرکنڈیشنڈ اسکولوں میں پڑھنے لگے، اس طرح دانستہ دو طبقے پیدا کے گئے۔ ملک کی ترقی کے نام پر لئے ہوئے قرضے ملک کے امین ہی کھا گے، گویا راہبر ہی راہزن بن گئے اور آج تک وہ ڈھٹائی سے یہ کام کر رہے ہیں۔

کیا اب بھی ہم خوابِ غفلت سے بیدار نہیں ہونگے ؟

شاید میری محترم والدہ کا خواب کبھی پورا نہ ہو، مگر مایوسی بزدلوں کی صفت ہے، ہم مایوس نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے کچھ نیک بندوں کو ضرور بھیجے گا جو اس ملک کو عروج پر لے جائینگے۔

مادر پدر آزاد ملک

جیسا کچھ اوپر میں نے پاکستان کا نقشہ کھینچا ہے، اس میں کسی کی اصلاح کو جانا اور کچھ اسکے اقدار بن جانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے جس طرح کا دوہرہ تعلیمی نِظام جاری کیا گیا اور اب تک جاری ہے، اس میں کسی کا انسان بننا یا صحیح العقیدہ مُسلمان بننا تو در کِنار، اگر وہ کچھ پڑھ لِکھ لے تو

غنیمت ہے، آج آپ کسی Graduate سے ایک Application ہی لکھوالیں، اگر وہ صحیح لکھ دے تو اُسے غنیمت سمجھیں۔

خیر ایسے مُلک میں کچھ اَیسے لوگ بھی تھے جوقوم و مِلّت کا درد رکھتے تھے اور آج بھی ہیں جو اپنا سب کچھ تج کر دوسروں کی اِصلاح اور خِدمت کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔

ہم بھی اس مُلک میں ہجرت کے بعد جب بیس سال کی عُمر کو پہنچ گئے اور ایک کڑیل جوان بن گے تو سامنے نہ کوئی نصبُ العَین تھا نہ مقصد، دوستوں کی ایک بے ہنگم ٹولی تھی، کالج میں پڑھتے تھے، شرارتیں عرُوج پر تھیں، ہماری زندگی کو دیکھ کر والدہ بھی پریشان تھیں، بے شک والدہ کی تعلیم وتلقین کی وجہ سے بالکل بے لگام نہیں ہوئے تھے۔ ایسے میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے پاس ایک مصلح کو بھیج دیا۔

ہمارے مصلح کون تھے

مَولانا محمد یوسُف دَہلوی نقشبندی

جیسا کہ میں نے پچھلے مضمون میں ذِکر کیا ہے کہ مادر پدر آزاد مُلک میں ہم بھی مادر پدر آزاد نوجوان تھے، مگر ہمارے مُحلّہ میں ایک نوجوان بُزرگ مولانا محمد یوسُف دَہلوی رہتے تھے، وہ انتہائی خلیق انسان تھے، رات دِن مُحلّہ سے گزرتے ہوئے ہم سب نوجوان دوستوں کا جائزہ لیتے تھے، چونکہ طبیب بھی تھے، اس بہانے کبھی کبھی ہماری نبض بھی دیکھتے اور کبھی کبھار دوائی بھی دیتے، اس طرح انھوں نے ہم سب دوستوں سے رابطہ بڑھایا۔ ہم رمضان کے مُبارک مہینہ میں تاش کھیلتے اور وہ ہمارے پاس کچھ دیر بیٹھ جاتے، کبھی مٹھائی وغیرہ بھی دے جاتے، اس طرح آہستہ آہستہ ان کا مقام ہم لوگوں کے دِل میں بننے لگا، پھر انھوں نے ہم سب دوستوں کو قُرآن پڑھانے کی پیش کش کی اور اس کے لئے صرف ۱۵ منٹ مانگے، کسی کا انکار نہیں تھا، اس بہانے سب عشاء کی نماز پڑھنے لگے، کیوں کہ درس عشاء کے بعد ہوتا تھا۔ پھر دوستوں کی دِلچسپی ان میں بڑھنے لگی، جب ہم لوگوں کا

اخلاق دُرست ہوا تو گھر والے بھی ان کی عزّت کرنے لگے، اس طرح وہ کئی خاندانوں میں باعزت سمجھے جانے لگے اور ان کا اصلاحی دائرہ وسیع ہونے لگا۔

کچھ ہی عرصہ میں سب کی حالت بدلنے لگی، برائیاں چھوٹنے لگیں اور بھلائیاں پروان چڑھنے لگیں۔ ماشاء اللہ کیا ہی عمدہ طریقہ پایا تھا مولانا محمد یوسُف دہلوی صاحبؒ نے، طبیعت میں غصّہ کا نام نہیں تھا، نوجوان کو یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کسی سنجیدہ شخص کے پاس بیٹھا ہے، واقعی ایسے لوگ زمین پر اللہ کی رحمت ہوتے ہیں جہاں بھی ہوں۔ بے غرض انسان، سنّتِ انبیاء پر کاربند، بے غرض اتنے کہ پوری زندگی کسی دوست سے تحفہ تک قُبول نہیں کیا، اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔

ایک دفعہ ہم نے ان سے دریافت کیا کہ حضرت! آپ کے بھی کوئی اُستاذ ہیں؟ فرمایا کہ ان کے پاس چلوگے؟ ہم سب دوستوں نے حامی بھرلی، رمضان کی ستائسویں شب قدر کی رات تھی، حضرت ہمیں اپنے ایک بزرگ کے پاس شب بیداری کے لئے گئے۔ بس وہ روشن رات ہماری تاریکیوں کے لئے آخری رات ثابت ہوئی۔

ایک بڑے سے برآمدے میں ایک روشن چہرہ بزرگ سفید لباس، سفید ٹوپی، نہایت چمکدار چہرہ۔ میں یہ بات مبالغہ آرائی سے نہیں بلکہ حقیقت کے طور پر بیان کرتا ہوں کہ اگر لائٹ بجھادی جاتی، تو ان کے چہرے سے روشنی ہوجاتی ہم سب دوست ششدر رہ گئے اور حالِ دل سے

کہہ اُٹھے ''اِنْ ھٰذَاِلاّ مَلَکٌ کَرِیمٌ '' ہم بھی پچھلی صفوں میں مولانا محمد یوسُف صاحبؒ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان بزرگ کا نام حضرت صوفی محمد احمد صاحب تھا، چونکہ حضرت صوفی محمد احمد صاحب سلسلہ نقشبندیہ سے تھے، اس لئے ذِکر و مراقبہ کے بعد حاضرین سے مخاطب ہوئے مختصر مگر انتہائی مگر جامعِ بیان دیا، چونکہ شب قَدر کی رات تھی اور موقع غنیمت تھا، اس لئے مولانا یوسُف صاحب کی تلقین پر ہم سب دوست حضرت صوفی صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوگئے۔ ان کا طریقہ بیعت کچھ اس طرح تھا کہ پہلے پچھلے گناہوں سے توبہ کرواتے اور آئندہ کے لئے شریعت کی پابندی کا ارادہ کرواتے اور فرماتے کہ بس یہاں پابندی سے آیا کرو، سب ٹھیک ہو جاؤ گے۔

حضرت صوفی محمد احمد صاحبؒ

میرے پیر و مرشِد حضرت صوفی صاحبؒ ہندوستان کے شہر روہتک کے رہنے والے تھے اور تقسیم کے وقت ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے تھے، دنیوی تعلیم کے لحاظ سے B.A.B.T تھے اور بڑی عُمدہ انگریزی بولتے تھے، دینی علوم میں عالِم تھے اور سلسلہ نقشبندیہ سے تعلُّق تھا، اصلاحی تعلق حضرت مولانا زوّار حُسین صاحبؒ سے تھا اور ان ہی سے اِجازت یافتہ تھے، حضرت زوّار حُسین صاحبؒ خود صاحبِ تصنیف بزرگ تھے، ان کی چند کتابیں عِلمی حلقوں میں کافی مقبول ہیں جن میں سرِ فہرست عُمدۃُ الفِقہ اور عُمدۃُ السُّلوک خاص قابلِ ذِکر ہیں۔

حضرت صوفی صاحبؒ کی مجلس بھی عجیب وغریب رنگ لئے ہوئے ہوتی تھی، ایک طرف دنیاوی حکمت و تجربہ کی باتیں ہوتی تھیں تو دوسری طرف دنیا کی بے ثباتی کے بھرپور تذکرے ہوتے تھے، اکثر حضرت فرماتے:

دست بکار و دِل بیار

یعنی ہاتھ کو کام میں لگے رہنا چاہئے جبکہ دِل اللہ کی یاد میں مشغول رہنا چاہئے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بڑے ذاکر انسان تھے، اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کی سانسوں میں خوشبو مہکتی تھی، قریب بیٹھنے سے دِل پر عجیب سی روحانی کیفیت محسوس ہوتی تھی اور ایسی کیفیت تقریباً آٹھ دن تک رہتی تھی،

اُن کا طریقہ بیعت اس طرح تھا کہ پہلے وہ اپنے سامنے سب کو دو زانوں بٹھا لیتے پھر خطبہ ماثورہ پڑھتے، اگر لوگ زیادہ ہوتے تو رومال یا عمامہ لوگوں کے درمیان ڈال دیتے جس کو لوگ اپنے ہاتھ سے تھام لیتے، پھر سب کو گناہوں سے توبہ کرواتے اور آئندہ کے لئے شریعت کی پابندی کا اِرادہ کرواتے، پھر بیعت سے فراغت کے بعد ہر شخص اِنفرادی ان سے مُصافہ کرتا، اُس وقت وہ ہر شخص کے قلب پر اپنی شہادت کی اُنگلی رکھ کر تین بار بڑی گہرائی سے اللہ اللہ اللہ کہتے اور فرماتے کہ اِنشاء اللہ اس طرح تمہارے دِل پر اللہ کا نقش اُتر جائے گا، اور فرماتے کہ اِس فقیر کی اُنگلی جس کے قلب پر ایک دفعہ بھی اگر لگ گئی تو وہ اِنشاء اللہ ایمان پر مریگا۔ اُن پر رحمتِ اِلٰہی کا بڑا غلبہ رہتا، اس لئے اُن کی مجلس میں خوفِ اِلٰہی یا عذابِ

اِلٰہی کے چرچے زیادہ رہتے، وہ اللہ کی عظمت اِس پیار سے بیان فرماتے کہ لوگوں کو گناہوں والی زندگی سے شَرم آنے لگتی، کبھی اپنی تعریف نہ کرتے نہ ہی پسند فرماتے، اپنے خِطاب میں زیادہ تر بزرگوں کے واقِعات بیان فرماتے اور اُن میں اُن واقِعات کو زیادہ منتخب فرماتے جِن میں درگُور اور اِحسان کا پَہلو زیادہ نُمایاں ہوتا۔ خود بھی پوری جماعت کو ایک دوسرے پر اِحسان و درگُور کرنے کی تلقین فرماتے، امیر مریدوں سے کہتے کہ وہ غریب ساتھیوں کے مسائل حل کریں۔ اگر کوئی اُن کی دعوت کرتا تو امیر غریب دونوں ہی کی رِعایت کرتے، زیادہ تر غریب مریدوں کو تَرجیح دیتے۔ خود ہمارا مکان اُن دِنوں ایک چھوٹے سے مُحلّہ میں واقع تھا اور اُن کو سیڑھی چھڑھنے کی مُمانِعت تھی مگر میرا دِل رکھنے کی خاطر وہ سیڑھی چڑھ کر ہمارے گھر آئے۔

اُن کی مجلس میں ہر شخص بڑا Relax رہتا، ہر کِسی کو سوال کرنے کی اِجازت تھی، اگر کسی کو کوئی بات سمجھنی ہو، چاہے وہ دینی ہو یا دُنیوی، دونوں صورتوں میں اُسے بڑے پیار و مُحبت سے سمجھا دیتے، اگر کوئی بات پورے مجمع کے لئے مُفید ہوتی تو سب کو متوجہ فرمالیتے ورنہ تخلیہ کر لیتے۔

مشورہ

اُن سے دُنیوی معاملات میں مشورہ بڑا ہی مُفید رہتا، مثلاً ایک دفعہ میں نے اُن سے مشورہ کیا کہ میں اناج کا کاروبار کرنا چاہتا ہوں؟ جواب

میں فرمایا: دیکھو امان اللہ! تم سب سے پہلے اناج منڈی میں جاؤ، وہاں کچھ لوگوں سے پہلے مشورہ، کرلو پھر کچھ دِن منڈی میں رہ کر بھی دیکھو، پھر ساری نوعیّت میرے پاس لے کر آو، اُس کے بعد ہم بیٹھ کر مشورہ کرینگے۔ اُن کے اس انداز سے مجھے اِنتہائی فائدہ پہنچا، پھر زندگی بھر مجھ میں یہ سمجھ آگئی کہ کِسی کام کے کرنے سے پہلے اُس کے سارے پہلو دیکھ لینے چاہئیں اور یہی صحیح طریقہ ہے۔

پھر کئی سالوں کے بعد ایک دفعہ پھر مجھے اُن سے مشورہ کی ضرورت پڑ گئی، اُس وقت میں سعودی عرب میں تھا، ایسٹ پاکستان، بنگلہ دیش بن چکا تھا جس میں ہمیں کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا، اس لئے میں تھک ہار کر سعودی عرب تجارت کی غرض سے چلا آیا تھا مگر کوئی تجارت کی صورت بن نہیں رہی تھی، اب میں حضرت صوفی صاحبؒ کو کہاں سے ڈھونڈوں۔ اچانک ایک پیر بھائی نے بتایا کہ حضرت حج کے لئے تشریف لا رہے ہیں، بس پھر کیا پوچھنا، میں خوشی سے اُچھل پڑا، حضرت سے مکہ شریف میں مُلاقات ہوگئی، ساری کیفیت بتائی، حضرت نے سب سے پہلے تو یہ وصیّت فرمائی کہ یہاں سے نِکلنا مت، دوسری جو سب سے قیمتی بات بتائی وہ یہ تھی کہ دیکھو امان اللہ! کراچی میں پہلے تمہارے معاشی حالات ٹھیک نہیں تھے پھر ماشاء اللہ تم ایک آسودہ اور مالدار شخص بن گئے، اب تمہارے معاشی حالات پھر خراب ہوگئے ہیں، ایسے شخص کے ساتھ ہوتا یہ ہے کہ وہ اپنی سیٹھائی بھول نہیں پاتا اور بڑا کام ہی کرنا چاہتا ہے۔ بس تم یہ سمجھو کہ تم کچھ بھی نہیں تھے اور پھر

''الف'' اور ''با'' سے شروع کردو، پھر دیکھو تمہارے حالات کیسے تبدیل ہوتے ہیں۔ ان دونوں نصیحتوں کو میں نے اپنے پلّے باندھ لیا اور محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور میری والدہ کی دُعاؤں اور حضرت صوفی صاحبؒ کی دُعاؤں کی برکت سے آج اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دے دیا ہے، یہ محض اس کا فضل وکرم ہے۔ یہ تھے ہمارے بزرگ جو ایک طرف ہمارے روحانی مربی تھے تو دوسری طرف ہمارے مُشیر، ہمارے دوست بھی تھے، اللہ تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے۔آمین۔

کچھ روحانی حالات

طریقت وشریعت کے بارے میں تو آپ نے کافی سُن رکھا ہوگا، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو طریقت کو شریعت سے جُدا سمجھتے ہیں اور جاہل صوفیوں کی من مانی کرنے کو طریقت قرار دیتے ہیں اور اپنی جہالت میں یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ اہل اللہ شریعت کی پابندی سے نعوذ باللہ مُبرّا ہیں یعنی آزاد ہیں۔

یاد رہے کہ اہلِ سُنّت و جماعت کے نزدیک یہ گُمراہی اور نرا جہل ہے بلکہ اہلِ سُنّت و جماعت کے نزدیک اس وقت تک کوئی شخص کامل ولی نہیں بن سکتا جب تک وہ شریعت مطاہرہ کا پورا پورا پابند نہ ہو جائے۔ قُرآن وسُنّت کے واضح دلائل کی روشنی میں جو شخص جتنا قُرآن وسُنّت کا پابند ہوگا، اُتنا اُتنا وہ قُربِ اِلٰہی کی طرف بڑھتا چلا جائیگا، اور کسی شخص کو

روحانی معراج نصیب ہو نہیں سکتی جب تک وہ قرآن و سُنّت میں مندرج اور سرکارِ دو عالم ﷺ کی سیرت مُبارکہ اور ذاتِ گرامی قدر میں موجود اخلاقیات کو مشعلِ راہ نہ بنا لے، روحانی منزِل کا تعین ہی اخلاقی عُروج سے وابستہ ہے۔ اسی لئے اللہ ربُّ العزّت نے اپنے محبوب ﷺ کو مُخاطب کر کے فرمایا کہ:

اے رسول ﷺ آپ اخلاق کے بُلند مرتبہ پر فائز ہیں۔

(سورۃ القلم آیت نمبر ۴)

خلاصہ اوپر کی بات کا یہ نکلا کہ شریعت و طریقت یہ ہے کہ انسان ایمان لانے کے بعد شریعت کا اس طرح پابند ہو جائے جس طرح اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے عمل کر دِکھایا، یہ ہے شریعت و طریقت باقی سارے خود ساختہ راستے گُمراہی کی طرف لے جاتے ہیں:

سرکار کی سُنّت میں جنت کی ضمانت ہے لوگ خود ہی
بھٹکتے ہیں خود ساختہ راہوں میں۔

اس مُختصر تمہید کے بعد ہم اصل مَوضُوع کی طرف آتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ اہلِ حق اس بات کے قائل ہیں کہ کشف و اِلہام برحق ہے مگر یہ کیفیت بھی اِکتسابی نہیں بلکہ عطائی ہوتی ہے، اگر اِکتِسابی ہو تو وہ شُعبدہ بازی ہے اور اگر عطائی ہے تو اللہ کا فضل ہے اور یہ فضل اِلٰہی ہمارے صوفی صاحبؒ پر بدرجہ اتم تھا، مُریدین کی "جس طرح اصلاح فرماتے، اس

نے ایسا لگتا تھا کہ گویا وہ اکثر لوگوں کے حالات سے بالکل آگاہ ہیں۔ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت بعض! دفعہ آپ ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو ہمارے بارے میں ہم ہی جانتے ہوتے ہیں مگر وہ بات آپ کی زبان پر آجاتی ہے اور ہم ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں، اور کافی حضرات اس بات کو محسوس کرتے ہیں، کیا آپ کو ہمارے حالات پتہ چل جاتے ہیں؟ تو مُسکرا کر فرمایا: تم لوگ سب میرے پاس اپنی اِصلاح کی غرض سے آتے ہو، یہی سب سے بڑی دلیل آپ لوگوں کی عِند اللہ مقبولیت کی ہے، اور ہم یہاں رات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرتے ہیں کہ:

> یا اِلٰہی! یہ سب تیرے بندے اپنی اِصلاح چاہتے ہیں، ہمیں کچھ آتا واتا نہیں، اب تُو ہی ہماری مدد فرما اور ان کے عیُوب پر آگاہ فرما تا کہ ہم ان کی اِصلاح کریں

اب ہوتا یہ ہے کہ جب تم لوگ میری مجلس میں آکر بیٹھ جاتے ہو تو چاہتے نہ چاہتے کچھ مَوضُوع مجھ سے چھڑ جاتے ہیں اور یہ مَوضُوع جس جس کے مُتعلّق ہوتے ہیں ان کو لگتے چلے جاتے ہیں، اکثر ہمیں خود پتہ نہیں چلتا کہ ہم کس کے مُتعلّق یہ بات کہہ رہے ہیں، ہاں کبھی کبھار پتہ چل جاتا ہے اور یہ محض بفضل تعالیٰ ہوتا ہے۔

ایک دفعہ میں نے اس بات کا ذِکر میرے ایک دوست سے کیا، انھوں نے کہا کہ میں اس بات کو نہیں مانتا، میں نے اِصرار کیا کہ وہ میرے

ساتھ صوفی صاحبؒ کی زیارت کو چلے آئے، ابھی ہم محفل میں بیٹھے ہی تھے کہ صوفی صاحبؒ نے فرمایا:

کسی کو یہ حق نہیں کہ بغیر اِجازت کسی کی چیز استعمال کرے، یہاں تک کہ کوئی بھائی اپنے بھائی سے پوچھے بغیر اس کی بوٹ پالِش سے اپنے بوٹوں پر پالش بھی نہیں کرسکتا۔

میرے دوست میرے پاس ہی بَیٹھے تھے، سرگوشی کے انداز میں کہا کہ یار امان اللہ! میں نے آج ہی اپنے بھائی کی اِجازت کے بغیر پالِش کی ہے اور ان ہی بوٹوں میں یہاں آیا ہوں، یہ تو واقعی عجیب بات ہے۔ ایک ہمارے اور دوست جو کالج میں پڑھتے تھے، ایک دفعہ کسی لڑکی کو چھیڑ دیا، جب حضرت کے پاس آئے اور ابھی وہ ان کے دروازے پر ہی تھے کہ حضرت نے گھور کر فرمایا "لوگوں کی حالت دیکھو! لڑکیوں کو خود بھی چھیڑتے ہیں اور پھر اوروں کو بھی کہتے ہیں چھیڑو، اگر ان کو ذِکر سیکھنا ہے تو یہ حرکتیں چھوڑنی پڑیں گی" اس بات پر میرے دوست بھی حیران ہو گئے اور آئندہ کے لئے تائب بھی ہو گئے۔

ایک دفعہ ایک اور صاحب تشریف لائے اور عرض کیا کہ حضرت قرضہ کافی ہے دُعا فرمائیں، حضرت نے فرمایا کہ قرض ادا کرو چاہے تمہیں اپنا سب کچھ بیچ دینا پڑے، اس نے کہا کہ حضرت! میں اس طرح تو سڑک پر آجاونگا، حضرت نے فرمایا کہ قرض ادا کرنے کی نِیت بھی ہے کہ نہیں؟ اس

نے کہا بالکل ہے، پھر اس سے پوچھا کہ کہنا مانو گے؟ اس نے کہا ضرور، اس پر حضرت نے فرمایا کہ جاؤ گھر کے علاوہ سب کچھ بیچ دو، جو رقم آئے اس سے فلاں چیز خرید لو (اِس وقت مجھے وہ چیز یاد نہیں رہی) اس نے ایسا ہی کیا، چند دِنوں میں ہی حکومتِ پاکستان نے اس آئٹم کو Banned کر دیا اور اس کے دام آسمان سے باتیں کرنے لگے، اس طرح اس شخص کے قرضے اُتر گئے۔ اگر کسی کے دانت میں کیسا ہی شدید درد ہوتا۔

حضرت دانت پر اُنگلی رکھتے، دانت کا درد چلا جاتا۔ ایک دفعہ ایک نوجوان چیختا چلاّتا آیا کہ حضرت! دانت میری جان لے لے گا، کوئی عِلاج کارگر نہیں ہوا، آپ کا سن کر آیا ہوں، آپ نے فوراً شفقت سے دانت پر اُنگلی رکھی، دانت کا درد اور بڑھ گیا، حضرت حیران ہو گئے اور فرمایا کہ بھئی کوئی گڑ بڑ ہے، کسی کا دِل تو نہیں دُکھایا؟ نوجوان نے نفی میں سِر ہلایا، حضرت نے معذِرت چاہی اور فرمایا کہ کوئی اور عِلاج کر لو۔ اُسی روز شام کو ایک بوڑھی عورت حضرت صوفی صاحبؒ کے پاس آئی اور روتے ہوئے کہا کہ حضرت! میرے بیٹے کے دانت میں درد ہے اور تڑپ رہا ہے، کوئی تعویز وغیرہ لکھ دیں، حضرت فوراً چونک گئے اور فرمایا اماں! وہ تمہارا بیٹا ہے جو صبح آیا تھا؟ اس نے کہا ہاں وہ صُبح آیا تھا، حضرت نے اس بوڑھی سے پوچھا کہ کیا وہ تم کو ستاتا تو نہیں، کہیں تمہارا دل تو نہیں دُکھاتا؟ وہ بوڑھیا بیچاری رونے لگی مگر ماں تو ماں ہوتی ہے، کہنے لگی حضرت! چھوڑیں، اس کے دانت کا کچھ کریں، حضرت نے اِصرار فرمایا کہ نہیں مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟ بوڑھیا

نے بتایا کہ میں اس کے ساتھ رہتی ہوں، اس کے دو بچے ہیں دوسری منزل پر رہتے ہیں، اسکی بیوی مُجھ سے پانی بھرواتی ہے اور میں پانی لے کر دومنزل اِس عُمر میں چڑھتی ہوں اور اِس حالت میں وہ مُجھے دیکھتا ہے اور اِحساس تک نہیں کرتا، حضرت انتہائی رقیق القلب تھے جذبات میں آگئے، حضرت سے بَیٹھا تک نہیں جارہا تھا، فرمایا کہ فوراً اس کو یہاں پکڑ کر لے آؤ ورنہ اس کا دانت کبھی ٹھیک نہیں ہوگا، وہ بوڑھیا بیچاری بھاگی بھاگی اپنے بیٹے کو لے آئی، وہ اُسی طرح تڑپ رہا تھا، حضرت نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے، اپنی ماں سے کس طرح کا سُلوک کرتے ہو؟ کیا تمہاری ماں نے تم پر بول وبراز کر دیا تھا؟ اس نے کہا نہیں حضرت میں کب کہتا ہوں، حضرت نے جواب دیا کہ تو نے تقریباً تین سال مُسلسل اپنی ماں پر بول و براز کیا، اس کے پیٹ میں رہا کہ اس کا دو سال تک دودھ پیا، اِس بیوہ عورت نے اپنی جوانی قُربان کر کے تُمہیں یہاں تک پہُنچایا اور آج تو اس سے پانی بھرواتا ہے اور فرمایا کہ یہ تمہاری والدہ ہے، اگر اس کی جگہ تمہاری کوئی نوکرانی اِس عُمر کو ہوتی، تب بھی میں تُمہیں اِجازت نہ دیتا کہ تو اس سے پانی بھروا۔ اور پھر جوش سے فرمایا! اب تو دیکھ رہا ہے کہ تیری کیسی پکڑ آئی ہے، پھر اُسے حُکم دیا کہ فوراً اپنی والدہ کے پاؤں پکڑ اور معافی مانگ اور آیندہ کے لئے اِس کا ادب پورے طُور پر ملحُوظ رکھنا، جب حضرت کے حُکم پر اُس نے اپنی والدہ کو راضی کرلیا تو حضرت نے فرمایا کہ آؤ اب دِکھاؤ تمہارا دانت کہاں ہے؟ خُدا کی قُدرت تھی، حضرت نے جیسے ہی دانت پر اُنگلی رکھی، دانت کا درد غائب

ہوگیا گویا کبھی تھا ہی نہیں۔

ایک دفعہ ایک عورت اپنی نوجوان بیٹی کو لے کر آئی، حضرت چونکہ عورتوں کا سامنا نہیں کرتے تھے، اس لئے ایسے موقعوں پر اپنی اہلیہ صاحبہ کو بُلا لیتے اور اُن کے واسطہ سے بات کرتے، پوچھا کیا مسئلہ ہے؟ اُس عورت نے عرض کیا حضرت! شاید میری بیٹی پر کوئی جن کا سایہ وغیرہ ہے، بار بار بے ہوش ہو جاتی ہے، حضرت نے پوچھا اِس کی منگنی وغیرہ ہو گئی ہے؟ جواب دیا ہاں، کچھ عرصہ پہلے ہی ہوئی ہے، پھر انھیں ساتھ والے کمرے میں اِنتظار کرنے کے لئے فرمایا، پھر اپنی اہلیہ سے کہا کہ اِس لڑکی پر جن وغیرہ کچھ نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو جن یہاں تک نہ پہنچ پاتا، یہ لڑکی ڈھونگ کر رہی ہے، اِس کو کہیں اور شادی کرنی ہے، اِس سے صاف پوچھ لو اور اگر وہ مان جائے اور بتادے تو اُس کی والدہ کو سارا ماجرہ بتادو ورنہ اِدھر اُدھر جھوٹے عامِلوں کے چکّر میں لڑکی تباہ ہو جائیگی۔ حضرت کی اہلیہ جنہیں ہم مائی صاحبہ کہتے تھے، انھوں نے اس بچّی کی والدہ سے مذکورہ بات کہہ دی، وہ تو ششدر رہ گئی، ماننے کو تیار نہیں تھی پھر بچّی کو بُلایا اور اُس سے کہا کہ تمہاری نجات اِسی میں ہے کہ جو سچ ہے وہ کہہ دو، لڑکی مان گئی اور سارا قصّہ سُنا دیا، پھر حضرت کے کہنے پر بچّی کے والد کو بُلا کر ساری نوعیت سمجھائی اور یہ بھی نصیحت فرمائی کہ جذبات میں آنے کی ضرورت نہیں، اگر وہ رشتہ جس کو لڑکی نے پسند کیا ہے، مُناسب ہو اور قابلِ قُبول ہو، خاندانی لحاظ سے بھی اور لڑکے کے لحاظ سے بھی تو تذبذب کا شِکار ہونے کی ضرورت نہیں، اِن

بچوں کو ساری زندگی اُلجھے ہوئے رکھنے سے بہتر ہے کہ ابھی سے اِن کی اُلجھن دور کردو اور جس خاندان میں منگنی ہوئی ہے وہاں کوئی عذر پیش کردو، بعد کی طلاق سے آج کی فسخ منگنی بہتر ہے۔ یہ بات لڑکی کے والد کی سمجھ میں آگئی۔ یہ تھے ہمارے مُصلح اور مُرشِد جو زندگی کے ہر موڑ پر راہنمائی کرتے تھے۔

مندرجہ بالا واقعہ کے ضمن میں حضرت نے فرمایا: جن اور بھوت کے تقریباً ۹۹ فیصد واقعات جھوٹے ہوتے ہیں۔ اس پر میں نے حضرت سے پوچھا کہ حضرت! ہم لوگ جن کا نام سُن کر ویسے ہی ڈر جاتے ہیں، جب ہمارے سامنے کوئی ایسا واقعہ آئے تو ہم کیا کریں اور کس طرح طے کریں کہ یہ واقعہ ایک فیصد سے ہے یا ۹۹ فیصد سے ہے؟ حضرت نے مُسکرا کر فرمایا امان اللہ! تم بھی عجیب لڑکے ہو، کیا ایک فیصد کی بھی ضمانت چاہتے ہو؟ میں نے کہا حضرت! پھر پیر کا فائدہ کیا۔ حضرت میرے جواب سے بڑے محظوظ ہوئے اور فرمایا: جاؤ ڈرو نہیں، جب بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آئے تو تم آسیب زدہ شخص کے منہ پر تھپڑ مار دینا، اگر جن ہوگا تو بھاگ جائیگا اور اگر ڈرامہ ہوگا تو وہ شخص صحیح ہو جائیگا۔ میں نے عرض کیا حضرت وہ تھپڑ مارنے سے جان پر آگیا تو کیا کروں؟ مجھے دوسرا داؤ تو بتادیں، حضرت بہت ہنسے میرے اس جواب سے، پھر فرمایا دیوانے! دیکھ جس وقت تو نے میرے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اُس وقت ساتھ ساتھ میں نے تم سے ایک جن کی بیعت بھی لے لی تھی، میں چونکا حضرت یہ کیا! حضرت نے فرمایا ایک صحابی

تھے رسول ﷺ کے اُن کا نام تھا حضرت سمعونؒ اور وہ جن تھے، اب تو اُن کا انتقال ہو چکا ہے مگر اُن کے کافی شاگرد اِس وقت دُنیا میں، مَوجود ہیں اِن حضرت سَمعونؒ سے بیعت کا جو سلسلہ چلا ہے وہ مجھ تک بطریق تواتر پہنچا ہوا ہے، اِس لئے اب تم بھی اِس سلسلے میں شریک ہو، اس لئے تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بات سُن کر مجھے تسلّی ہو گئی کہ چلو ہم بھی جن کی پارٹی کے ممبر بن گئے ہیں (ہو سکتا ہے ایسی باتیں کسی کی سمجھ میں نہ آئیں مگر ہمارا مُشاہدہ ہے اور ہم قطعاً کوئی وہمی انسان نہیں۔ (مولف امانُ اللہ اسماعیل)

جنّات بھی اللہ کی مخلوق ہیں اور اُن کا مخلُوقِ خُدا ہونا قُرآن وسُنّت سے ثابت ہے، البتہ اُن کا دائرہ عمل اور اُن کی حیات ہماری حیات سے متخلف ہے، اِس بات کا یہاں مَوقع نہیں ورنہ ہم اِس مَوضُوع پر یہاں ضرور بحث کرتے اور قُرآن وسُنّت وآثار سے اِس بات کو ثابت ضرور کرتے۔ سرِدَست ایک دو واقعات کا ذکر کرتے ہیں جن کا مُشاہدہ ہم نے صوفی صاحبؒ کے یہاں کیا تھا کا ذِکر کرتے ہیں۔

صوفی صاحبؒ نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں اپنے برآمدے میں بَیٹھا مُراقبہ کر رہا تھا، آنکھیں بند تھیں اور ذِکرِ اللہ میں مشغول تھا، اچانک میں نے محسوس کیا کہ کسی نے میری ران پر زور سے ہاتھ مارا، میں چَونک گیا، آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک نَوجوان عَورت میرے سامنے بَیٹھی مجھے گھور رہی تھی، میں فَوراً اُٹھا اور جلدی سے اپنی اہلیہ کو بُلایا کہ دیکھو یہ کون عَورت

یہاں آگئی ہے؟ میری اہلیہ نے فوراً اُس کے سر پر ڈوپٹہ ڈال دیا اور اُس کے قریب بیٹھ کر پیار سے پوچھا بیٹی تم کون ہو؟ مگر وہ لڑکی اپنے ہوش وحواس میں ہی نہیں تھی، اِتنی دیر میں میں نے پانی پر دَم کر کے اپنی اہلیہ کو دیا کہ اُس کے منہ پر چھڑک دو، منہ پر پانی لگتے ہی وہ لڑکی ہوش میں آگئی اور فوراً دوپٹہ سنبھال کر سیدھی بیٹھ گئی۔ پھر میری اہلیہ نے اُس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟ اُس نے کہا کہ میں فلاں صاحب کی اہلیہ ہوں جو آپ کے مُرید ہیں اور کچھ دن پہلے آپ سے میرے لئے تعویذ لے گئے تھے، حضرت نے فرمایا کہ میں سارا ماجرہ سمجھ گیا کہ یہ کیس (Case) کیا ہے، فوراً اُس لڑکی کے شوہر کو بلوایا اور اُس سے کہا کہ اُسے اپنے ساتھ گھر لے جاؤ اور اُس سے پوچھو کہ وہ ہمارے گھر تک کیسے پہنچی جب کہ وہ ہمارے گھر کا پتہ تک نہیں جانتی اور تمہارا گھر یہاں سے کافی دور بھی ہے؟ کیونکہ صُوفی صاحبؒ کا مکان سندھی مُسلم سوسائٹی میں تھا اور وہ لڑکی گارڈن سے آئی تھی، راستے میں اُن دنوں دو بَسیں بھی تبدیل کرنی پڑتی تھیں۔ اِس سوال کے جواب میں اُس لڑکی نے بتایا کہ وہ گھر میں اکیلی بیٹھی تھی کہ اُسمیں زبردست تقاضہ پیدا ہوا کہ وہ اپنے گریبان سے وہ تعویذ نکال دے، اور بالآخر اِس تقاضہ سے مغلُوب ہو کر اُس نے تعویذ نکال دیا، تعویذ نکالتے ہی میری طبیعت دیگر ہوگئی، پھر تقاضہ پیدا ہوا کہ میں یہاں سے اُٹھوں اور باہر جا کر فلاں نمبر کی بس میں بیٹھ جاوں، گویا اِس طرح مجھے کوئی مجبوراً چلا رہا تھا اور اِسی تقاضے کے تحت میں یہاں تک پہنچ گئی، جب آپ کو یہاں مُراقِب دیکھا

تو پھر یہ تقاضہ پیدا ہوا کہ میں آپ کو مس کروں مگر مجھ پر رعب طاری ہوگیا اور صرف آپ کے پیر پر ہاتھ مارنے کے بعد میں ٹھٹھر گئی یہ ہے، سارا قِصّہ۔ خیر صُوفی صاحبؒ نے اُسکے شوہر کے ساتھ اُس لڑکی کو تو واپس کر دیا اور اُن سے کہا کہ اب تم یہاں نہیں آنا اور نہ گھر سے باہر نکلنا، میں خود کل تمہارے یہاں آؤنگا۔

بعد میں صُوفی صاحبؒ نے پورا واقعہ اِس طرح بتایا کہ وہ صاحب جن کا ذِکر اِس واقعہ میں ہے، ایک دفعہ میرے پاس آئے کہ میری بیوی کی حالت اکثر عجیب وغریب ہو جاتی ہے، میرے اسکے قریب جانے پر بھی وہ غصّہ کرنے لگ جاتی ہے، اس پر صُوفی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ یہ تعویذ لے جاؤ، اگر وہ اِس سے صحیح ہو جائے تو خیر ورنہ اِس مسئلہ کو دوسرے زاویہ سے دیکھیں گے، پھر اتفاق سے تعویذ گلے میں ڈالتے ہی وہ لڑکی بالکل Normal ہوگئی اور پھر کچھ دنوں تک کوئی مسئلہ نہیں تھا، مگر کچھ دنوں بعد پھر وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذِکر اوپر کی سُطور میں کیا گیا ہے۔ اِس بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس لڑکی کو کوئی شیطان پریشان کرتا تھا، اِس لئے اُس کا روحانی عِلاج ضروری تھا، اِس بات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے حضرت نے اُن سے کہا کہ اب میں ہی تمہارے گھر آکر دیکھونگا کہ تمہارے گھر میں کیا ہے۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ دوسرے دن میں اُن کے گھر جانے کے لئے بس میں بیٹھا تو کچھ دور جا کر بس پہلے تو خراب ہوگئی، مجھے بس سے اُترنا پڑا پھر میں رِکشہ میں بیٹھا، وہ بھی کچھ دور جا کر خراب ہوگیا، میں سمجھ گیا کہ کوئی

شیطانی قوت مجھے وہاں جانے سے روک رہی ہے مگر میں بھی کہاں تھکنے والا تھا، اُن دِنوں گارڈن کے لئے ''ٹرام'' چلتی تھی، اُسی میں بیٹھ گیا، ابھی وہ کچھ چلی تھی کہ وہ بھی خراب ہوگئی، اب میں نے پَیدل چلنے کی ٹھان لی اور پَیدل اُن کے گھر پہنچ گیا، گھر میں مجھے صاف محسوس ہوگیا کہ ایک شیطان گھر میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھا ہوا ہے، میں نے کہا کہ اب اپنا بِستر ہ گول کرو، بہت ہوگیا اور اُن کے گھر میں کچھ نقش وغیرہ لکھ دیئے اور کچھ کیلیں ٹھوک دیں، اِس طرح اُس شیطان کا قصّہ پاک ہوا۔

ایک دفعہ میں خود حضرت کی محفِل میں موجود تھا، ایک صاحب اپنے چھوٹے بیٹے جس کی عُمر تقریباً تین سال ہوگی، ساتھ لے کر آئے، وہ صاحب سندھی تھے، خود اردو بولتے تھے جس طرح سندھی حضرات سندھی لہجہ میں اردو بولتے ہیں، مگر بچہ جو عُمر میں بھی چھوٹا تھا اور اردو بھی نہیں جانتا تھا، اچانک فَصیح اور بَلیغ اردو بولنے لگا تھا اور سندھی بھول گیا تھا، صوفی صاحبؒ نے پوچھا کیا ماجرہ ہے؟ اُس نے کہا کہ شام کو قریب کی جھاڑیوں میں کھیلنے گیا تھا اور اب اِس طرح کی حرکت کرنے لگا ہے۔ حضرت نے بچّے کو قریب بلایا، واقعی وہ فصیح اردو بول رہا تھا، حضرت نے فرمایا شاید کسی جِن کا مذاق ہے، اِس طرح کا مذاق جِن کے چھوٹے بچّے بھی کرتے رہتے ہیں، پھر بچّے کو اپنے قریب بلا کر تین دفعہ بڑی گہرائی سے اللہ اللہ اللہ کہا، بچّہ اچانک رونے لگا اور اپنے والد کو چِمٹ کر سندھی بولنے لگا اور اردو بھول گیا۔ یہ ساری کاروائی میری آنکھوں کے سامنے ہوئی تھی۔ ایسی باتیں ہیں، ساری

کی ساری عجیب سی مگر ماننے بغیر چارہ نہیں، کیونکہ ہمارے مُشاہدے کا کوئی کیسے انکار کرسکتا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی میں ضمناً عرض کردوں کہ ایسا ایک واقعہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا کہ اِن کی اہلیہ پر بھی جِن کا اثر ہوگیا تھا، حضرت ان کا طِبّی عِلاج کرتے تھے مگر ایک دفعہ ان کی اہلیہ پر کچھ بے خودی کے اثرات ظاہر ہوئے، اس وقت ان کی اہلیہ کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے کہ آپ عِلاج وغیرہ نہ کریں، میں جِن ہوں اور وہ یوں مُخاطِب ہوا کہ چونکہ آپ کی اہلیہ بہت عُمدہ تِلاوت کرتی ہے، اس لئے میں آکر سنتا ہوں، اس بات پر حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ میں کیسے مانوں کہ آپ واقعی جِن ہی ہیں، اس پر ان کی اہلیہ کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے کہ آپ میری کوئی آزمائش کرلیں، اس پر حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: اچھا اگر واقعی آپ جِن ہی ہیں تو کالی مِرچ کی ہری ٹہنی ابھی لادیں، کیوں کہ ان دنوں کالی مِرچ کا مَوسم بھی نہیں تھا، اس لئے حضرت نے اس کو طلب کیا، اس پر ان کی اہلیہ کا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور فوراً ہاتھ میں ایک کالی مِرچ کی ہری ٹہنی آگئی۔ حضرت حیران ہوگئے کہ یہ کیا؟ پوچھا پر کہ وہ کہاں سے لایا؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے ابھی سری لنکا کے ایک درخت سے توڑی ہے اور تازہ تازہ آپ کے ہاتھ میں رکھ دی ہے۔

میں نے یہ واقعہ ایک صاحب سے سُنا تھا، چونکہ بچپن سے تحقیق کی عادت پڑی ہوئی تھی، اس لئے میں بذاتِ خود حضرت مفتی صاحبؒ کے

صاحبزادے حضرت مولانا مفتی تقی محمد عثمانی صاحبؒ کے پاس گیا اور ان سے تصدیق کرائی، انھوں نے نہ صرف اس واقعہ کی تصدیق کی بلکہ کچھ اور واقعات بھی سُنائے۔

میرا ان واقعات کو بیان کرنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ لوگ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں جِنّات کے اثر و رُسوخ محسوس کرنے لگیں اور زندگی کے ہر نشیب و فراز کو اس زاویہ سے دیکھیں اور ساری تدابیر چھوڑ کر صرف جِنّات کی اثر اندازیوں پر تکیہ کرنے لگیں، میں نے مندرجہ بالا سُطُور میں حضرت صُوفی محمد احمد صاحبؒ کا وہ قول بھی درج کیا ہے جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ جِنّات کے اثرات اور واقعات میں ۹۹ فیصد واقعات حقیقی نہیں ہوتے، اس لئے معاملے کو ہر پہلو سے دیکھنا چاہیے، اور اگر کوئی ایسا مرحلہ آ ہی جائے تو عِلاج کسی ماہر اور اہل سے کروانا چاہیے جس طرح طِبّی دنیا کے بازار میں جاہل حکیم اور ڈاکٹروں کی بھرمار ہے، اُسی طرح اِس منڈی میں بھی لُٹیروں اور ڈاکوؤں کی کوئی کمی نہیں۔

ایک واقعہ ہمارے ایک ملازم کے ساتھ ہوا تھا کہ اس کی نوجوان لڑکی کافی عرصہ سے بیمار تھی، اس نے مجھ سے شِکایت کی، میں نے اسے اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے پاس بھیج دیا، ڈاکٹر نے تشخیص کے بعد بتایا کہ لڑکی کے دل کا آپریشن فوراً کروانا ضروری ہے، اس کے دل میں سُوراخ ہے، میں نے اپنے اس ملازم سے کہا کہ عِلاج کا پورا خرچ میں برداشت کرونگا، انھوں نے مجھ سے مشورہ کے لئے ایک دن مانگا، میں نے کہا جاؤ کر

لو۔ایک دن کے بعد وہ آیا اور کہا کہ گھر کی عورتیں اور دوسرے افراد کا خیال ہے کہ بچّی کو جن کا سایہ ہے اور کچھ نہیں، ہم اسے عامِل کے پاس لے جائینگے۔ اُس کمذات عامِل نے آٹھ دن اس بچّی کا عِلاج کیا، نویں دن وہ بچّی انتقال کرگئی، پتہ نہیں ایسے کتنے واقعات ہوتے ہونگے۔

عامِلوں کی حقیقت

دراصل ان توہمات کے پھیلنے پھولنے میں اور ان جاہل عاملوں اور ڈاکٹروں کی بھرمار میں ہماری معاشرتی زندگی اور سیاسی عدم اِستحکام کا بھی بڑا دخل ہے، پوری قوم بیمار ہو اور حکومت کی طرف سے اُن کے عِلاج مُعالجہ کا کوئی انتظام نہ ہو، پرائیویٹ ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کو لوگوں کو لُوٹنے کی کھلی آزادی ہو، وہاں بیچارہ ایک غریب شہری کیا کریگا؟ اس کو چاہتے نہ چاہتے اپنی عافیت اِسی نقلی ڈاکٹر اور حکیم ہی میں نظر آتی ہے جو اسکی گلی کے نکڑ پر خوبصورت Clinic سجائے بیٹھا ہے، اسے ہر بیماری سے نجات کا مژدہ سناتا ہے اور فیس بھی آدھی لیتا ہے، بات بھی بڑے اِخلاق سے کرتا ہے، دوسری طرف جاہل عامِل بیٹھے ہوئے ہیں، ان کا دعویٰ تو حیران کن ہوتا ہے، آپ نے اکثر ان کے اشتہارات پڑھے ہونگے جس میں دنیا میں اترنے والی ہوئی ہر مُصیبت سے آپ کو نجات دِلانے کا مژدہ سناتے ہیں۔ ان کے پاس بھی آپ کو غریب پریشان لوگوں کی بھرمار ملے گی، ان کے دلال رات دن لوگوں میں جاکر ان کے کرامات سناتے رہتے ہیں اور لوگ ان کی باتوں

میں آ کر ان پر گرے پڑتے ہیں، مگر افسوس صد افسوس! ان جاہلوں کو لگام دینے والا کوئی نہیں، آج کل تو شام کے اخبارات میں ان کی جتنی ADS ہوتی ہیں، وہی ان کے بزنس کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے۔

میں حکمراں طبقہ سے بھی دردمندانہ گذارش کرتا ہوں اور علماءِ کرام سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ اس سے پہلے کہ پوری قوم اِس جاہلیت کی غار میں اتر جائے، اِسے روکنے کے لئے ایک زبردست تحریک چلائی جائے اور دوسری طرف لوگوں کے مسائل صحیح طریقے سے حل کرنے کا بندوبست بھی کیا جائے۔

ورنہ تمہاری داستان بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

یہاں ایک بات قابلِ غور یہ ہے کہ خود رسول ﷺ اور صاحبہ کرامؓ کا یہ طرزِ عمل قطعاً نہیں تھا کہ وہ اس طرح کے وظائف کرتے جس طرح کے وظائف کا بازار ان عاملین نے لگایا ہے، ان حضرات کی جو عادتِ شریفہ اس ضمن میں تھی وہ یہ تھی کہ بس وہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے اور یہی طریقہ انھوں نے آگے پوری امّتِ مُسلمہ کو تعلیم کیا۔ دُعا میں انسان کی عاجزی ظاہر ہوتی ہے اور یہی بندگی کا خاصہ بھی ہے جبکہ تعویذ و وظائف میں عبدیّت ظاہر نہیں ہوتی، یہی مسلک علماءِ، اور اہلِ حق کا بھی ہے، اس لئے انسان کو چاہئے کہ جب اسے کسی چیز کی حاجت ہو یا کوئی تکلیف ہو یا کوئی مصیبت آئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف خود ہی رُجوع کرے اور قُرآن وسُنّت میں وارِد دُعاوں سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف مُتوجّہ کرے۔ اس طرزِ عمل سے

وہ سُنّت سے زیادہ قریب بھی ہوگا اور اللہ تعالیٰ سے اس کی اُمید بھی بندھے گی اور ساتھ ساتھ مغفرت کے اسباب بھی اختیار کرے۔

ہاں تو ہم حضرت صوفی صاحبؒ کی زندگی کے حالات بیان کر رہے تھے، اس میں بات کہیں دور نکل گئی، خیر جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت صوفی صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی نورانی بصارت عطا فرمائی تھی، وہ صاحب کشف انسان تھے۔ ایک دفعہ خود فرمایا کہ میں حج کے سفر میں تھا اور مِنیٰ سے عرفات جا رہا تھا کہ بس میں ایک شخص پیٹ کے درد میں مُبتلا سخت تکلیف میں کراہ رہا تھا، میرے پاس پیٹ کے علاج کی کچھ دوائی تھی، میں نے اس کو دینا چاہا مگر میں نے اپنے دل میں سخت تقاضہ محسوس کیا کہ میں اسے یہ دوائی نہ دوں، اسکے باوجود میں نے دوائی دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی غیبی طاقت میرا ہاتھ روک رہی ہے، اس لئے میں نے اس شخص کو دوائی دینے کا ارادہ ترک کر دیا، اس واقعہ کو چند منٹ ہی گزرے تھے کہ وہ شخص اپنی سیٹ پر انتقال کر گیا، اس وقت مجھے اس تقاضہ کا مطلب سمجھ میں آیا کہ اگر خدانخواستہ میں اسے دوائی دیتا اور اس طرح چند منٹ کے بعد اسکا انتقال ہو جاتا تو مجھے سعودی حکومت پکڑ لیتی اور میں بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا، اس طرح بزرگوں کی دعاؤں کی برکت سے میں بَلا سے محفوظ رہا۔

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت کا میرے ایک دوست کے ساتھ ہوا تھا، میرے دوست کی اہلیہ جوزچگی کے لئے ہسپتال میں داخل تھیں اور ڈاکٹروں

نے بتایا کہ بچہ آپریشن کے بغیر نہیں ہوسکتا، وہ دوست بھاگے بھاگے حضرت کے پاس گئے کہ حضرت! کیا کروں؟ حضرت نے فرمایا مجھے ہسپتال لے چلو، وہ فوراً حضرت کو اپنی گاڑی میں ہسپتال لے گئے، حضرت نے فرمایا مجھے باہر گاڑی میں ہی رہنے دو اور چند منٹ کچھ پڑھتے رہے، پھر میرے دوست سے فرمایا کہ اب اندر جاؤ اور اگر اب بھی ڈاکٹر کا اصرار ہو کہ آپریشن کے بغیر بچہ نہیں ہوسکتا تو اپنی بیوی کو گھر لے جاؤ، انشاء اللہ وہیں بآسانی بچہ ہو جائیگا اور دیکھو گھبرانا نہیں اور میری بات پر ہمت سے عمل کرنا۔ ہمارے دوست بھی پکے مُرید تھے، ڈاکٹر کے اصرار کے باوجود انھوں نے اپنی بیوی کو اسی حالت میں اٹھایا اور گھر لے گئے اور ماشاء اللہ گھر جانے کے بعد چند گھنٹوں میں اللہ نے بغیر آپریشن کے ایک ہنستا بولتا بچہ عطا فرمایا۔

یہ تھے ہمارے بزرگ حضرت صوفی محمد احمد صاحبؒ۔ انکی حیات کو دیکھ کر واقعی روحانی زندگی پر اور دعاؤں کی مقبولیت پر ہم لوگوں کے اندر گہرا یقین پیدا ہورہا تھا جو بعد کی زندگی میں بڑا کام آیا۔

انکی زندگی کا ایک اور واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے، انکی مجلس میں ایک سیٹھ صاحب نئے نئے آنے شروع ہوئے تھے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ سیٹھ لوگوں کے بھی بڑے مسائل ہوتے ہیں، اس لئے اکثر وہ بھی پیروں کے پاس نظر آتے رہتے ہیں، اپنی بڑی بڑی گاڑیوں میں پیروں کو لئے لئے پھرتے رہتے ہیں اور غریب مُرید بیچارے پیروں کو صرف تکتے رہتے ہیں، کیوں کہ پیر نے جس چیز کے لئے اپنی دکان لگائی تھی وہ گاہک اب اس کے

پاس پہنچ چکا ہوتا ہے، اس لئے اب اسے غریب مُریدوں کی ضرورت نہیں رہتی، مگر جو حضرات اہلِ حق ہوتے ہیں، ان کو دنیادار لوگ کبھی بھی اغوا نہیں کر سکتے اور اگر کبھی کوئی ایسا سیٹھ کچھ راہ پا لیتا ہے تو یا تو اس کی اصلاح ہو جاتی ہے یا پھر اسے ایسے بزرگوں کی محفل کو چھوڑ کر بھاگنا پڑتا ہے۔ خیر ہمارے حضرت صوفی صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی نورانی نظر عطا فرمائی تھی، کچھ عرصہ تک سیٹھ صاحب کا آنا جانا رہا پھر سیٹھ صاحب نے اصرار کیا کہ حضرت! ہم اپنے ایک نئے آفس کا افتتاح کر رہے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ تشریف لائیں اور دعا فرمائیں ۔حضرت نے بہت انکار کیا مگر وہ نہیں مانے، حضرت نے حامی بھرلی۔ سیٹھ صاحب نے کھانے کا انتظام بھی کیا تھا، حضرت کچھ غریب مُریدوں کو لے کر پہنچ گئے، جب دسترخوان چنا گیا اور حضرت کھانے کے لئے تشریف فرما ہوئے تو فوراً حضرت نے کھانے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ سیٹھ صاحب چونکہ قریب بیٹھے ہوئے تھے، چَونک گئے اور کہا کہ حضرت کیا بات ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ میں یہاں نہیں کھا سکتا، مجھے جانے دو۔ وہ سیٹھ صاحب بڑے گھبرائے اور کہا کہ حضرت کیا بات ہے؟ حضرت کے چہرے پر جلال نظر آ رہا تھا اور چونکہ حضرت کا کھانا الگ سے چُنا گیا تھا جہاں سیٹھ اور انکے پارٹنر ہی تھے، سارے چَونک گئے ۔جب حضرت نے کھانے سے بالکل معذرت ہی کر دی اور بغیر دُعا کے چلنے لگے تو انھوں (سیٹھ) نے کہا کہ حضرت! اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دیں ۔حضرت نے فرمایا کہ تم لوگ بڑے بے شرم ہو، کیا ہر صوفی کو تم نے

بِکاؤ مال سمجھ لیا ہے، اگر تم ابھی ابھی دو باتوں سے تَوبہ کرو تو میں دُعا بھی کرونگا اور کھانا بھی کھاونگا۔ سیٹھ نے کہا کہ حضرت ہم تیار ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ آج تم مجھے یہاں لائے ہو، حالانکہ کل رات تم یہاں فاحشہ عورتوں کو لائے تھے اور رات کو یہاں بڑا اُدھم مچایا تھا، مجھے یہاں کی دَر و دیواریں کہہ رہی ہیں، اس سے ہمیشہ کے لئے توبہ کرو اور دوسرے سودی کاروبار بالکل بند کردو، بولو تیار ہو؟ وہ سیٹھ تو حیران ہو گئے کہ رات والی بات حضرت کو کیسے پتہ چل گئی جو انتہائی رازداری میں کی گئی تھی۔ خیر حضرت نے ان سے کہا تھا اور وہ ایک حقیقت تھی اس لئے قدموں میں پڑ گئے اور توبہ کی اور سودی کاروبار ترک کرنے کا وعدہ کیا، تب جا کر حضرت راضی ہوئے، پھر میں نے دیکھا کہ ان کے سارے پارٹنروں کی اصلاح ہوگئی۔ آج بھی ایسے بزرگوں کی کمی نہیں، اگر طلب صادِق ہو تو اہلِ اللہ کی کمی نہیں، اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اہلِ اللہ کی صحبت میں انسان بننا آسان ہے، مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نیّتِ صادِق لے کر جائیں اور ایسے بزرگوں کی صحبت میں دنیا لینے کے لئے نہ جائیں، دنیا لینے کے لئے اور سمجھنے کے لئے دنیاداروں کی کمی نہیں۔ ہاں یہ بات بھی خوب سمجھنے کی ہے اور یاد رکھنے کی ہے کہ اہلِ اللہ کی صحبت میں جب صحیح ایمان بن جاتا ہے تو پھر ایسے شخص کی دنیا بھی خراب نہیں ہوتی، یہ ہمارا بھی اور ہزاروں کا آزمایا ہوا نسخہ ہے۔

حضرت ہمیں ہمیشہ اعتدال پسندی کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ علم حاصل کرنے کی تاکید فرماتے مگر یہ ضرور کہتے کہ علم حاصل کرنے کو میں

آسان خیال کرتا ہوں مگر اس کے بیان کو مشکل ترین کام سمجھتا ہوں اور اس کے لئے ایک خاص جملہ ادا فرماتے، کہتے "۱۰۰ گرام علم کے لئے ۱۰۰۰ گرام عقل چاہئے" ورنہ خیر کی جگہ شر پھیلے گا۔ خود ہر بات کو بڑے جچے تُلے انداز سے بیان فرماتے جو مختصر بھی ہوتی اور جامع بھی۔ ہمیں حضرت کی صحبت میں شرحِ صدر ہو گیا کہ واقعی اہل اللہ کی صحبت ضروری نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔

مسائل کے ادراک کا صحیح طریقہ

ہمارے بزرگ ہمیں مسئلہ کے صحیح ادراک کا طریقہ بھی بتایا کرتے تھے، اگر کسی نے اس طریقہ کو اپنی گانٹھ سے باندھ لیا تو پھر انشاء اللہ نہ وہ کبھی گُمراہ ہوگا اور نہ ہی کسی دینوی مسئلہ میں الجھے گا۔

۱: مسئلہ

۱۔ جب کسی اہم کام کا ارادہ کیا جائے تو پہلے مسنون طریقے سے اِستخارہ کرلیا جائے۔

۲۔ جس کام کا ارادہ کیا ہو، اس لائن کے اور اس کے اہل حضرات سے مشورہ کیا جائے۔

۲: اگر کبھی خدانخواستہ کوئی تکلیف یا مُصیبت آجائے

۱۔ پہلے اپنا جائزہ لیا جائے، اگر کوئی گُناہ ہو رہا ہو تو اسے فوراً ترک

کردیا جائے۔

۲۔ اس کے بعد رجوع الی اللہ اور توبہ اِستغفار میں مشغول ہو جائیں۔

۳۔ اس کے بعد ساری Situation کا دنیوی جائزہ لیا جائے اور جہاں خلاء نظر آئے اسے پوری ہوشیاری سے پُر کیا جائے، اگر کوئی دنیوی غلطی نظر آئے تو اسے فوراً درست کرنے کی کوشش کی جائے اور جو اپنے خیر خواہ ہوں اور اہل بھی ہوں تو ان سے مشورہ کیا جائے، اور فوری جذباتی قدم ہرگز نہ اٹھایا جائے۔

۳: اگر کوئی بیماری نظر آئے

۱۔ پہلے اپنی خوراک پر دھیان دیا جائے کہ کھانے پینے میں کوئی بد احتیاطی تو نہیں ہو رہی ہے۔

۲۔ اس کے باوجود اگر طبیعت نہ سنبھلے تو کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کیا جائے اور ضروری Tests اگر وہ تجویز کرے تو ضرور کروا لئے جائیں، ورنہ بعض دفعہ اصل مرض کی تشخیص ہوتی نہیں ہے اور اندر ہی اندر مرض بڑھتا چلا جاتا ہے۔

۴: اب ہم آتے ہیں جِنّات اور جادو کی طرف

مندرجہ بالا جتنے تشخیص کے طریقے ہم نے درج کئے ہیں، جب وہ سب ناکارہ ہو جائیں، تب جاکر کسی صحیح عامل یا بزرگِ دین کو جا کر معاملے

کی پوری نوعیت بتائی جائے اور پھر اگر ضرورت محسوس ہو تو روحانی علاج کیا جائے۔

۵: گھریلو جھگڑے اور روزی کی تنگی

اگر ہم چاہتے تو اس موضوع کو بھی ہم مندرجہ بالا فہرست میں شامل کر سکتے تھے، مگر ہم اس کا الگ سے ذِکر اس لئے کر رہے ہیں تاکہ اس موضوع پر کچھ وضاحت سے بات کریں، کیوں کہ یہی دو مسئلے ہیں جس میں لوگ زیادہ تر عاملوں کے چکّر میں آجاتے ہیں۔ اب ہم فرداً فرداً ہر مسئلے کو لیتے ہیں۔

ا۔ گھریلو جھگڑوں کے ویسے تو کئی اسباب اور پہلو ہیں مگر زیادہ تر جس پہلو سے عامل کی ضرورت زیادہ محسوس کی جاتی ہے، وہ ہے ساس بہو کا جھگڑا اور دوسرے نمبر پر بچیوں کے اچھے یا مُناسب رشتوں کا مسئلہ۔

ان دونوں مسئلوں نے تقریباً پوری قوم کو وبا کی صورت میں اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، عاملوں کے بھی بڑے مزے ہیں، وہ بھی ساس کو ظہر سے پہلے بُلاتا ہے اور بہو کو عصر کے بعد۔ دونوں کو ایک ہی نسخہ لکھتا ہے اور دوگنے پیسے کماتا ہے۔

کیا خوب دکانداری لگائی ہے، ہم تیس سالوں سے کپڑے کا کاروبار کر رہے ہیں، اتنا نہیں کما پائے جو عامل صاحب کما چکے ہیں، پھر عزت اور

آو بھگت الگ۔ نہ مال نہ گودام نہ سروے فارم نہ ٹیکس۔ واقعی دھندہ ہو تو ایسا ہو۔ ''نعوذ باللہ''

مجھے پتہ ہے ضیاء الحق کے زمانے میں ایک پیر صاحب کو ٹیکس والوں نے پکڑا تھا، اس نے جواب دیا کہ یہ کوٹھی یہ گاڑیاں سب مُریدوں کی طرف سے بخشش ہیں اور یہ کہ میں مُریدوں کو رسید کاٹ کر تو دیتا نہیں ہوں کہ حساب رکھوں، بس آتے ہیں اور ڈال کر چلے جاتے ہیں، یہ تھا ان دین کے تاجروں کا جواب حکومت کو۔

ساس بہو کے جھگڑے کی اصل بنیاد

ہم سب جانتے ہیں کہ ساس بہو کا جھگڑا ازل سے ہے اور قیامت تک چلے گا، کوئی عامل کا باپ بھی اسے ختم نہیں کر سکتا، البتہ اگر ہم چاہیں تو اسے قابلِ برداشت بنا سکتے ہیں، اس کی سب سے بنیادی وجہ ہمارے معاشرے کی غلط ترکیب ہے۔ یہ جو لڑکی کے والدین سے لڑکے والے جہیز اور پگڑی کے نام پر جو غیر ضروری مُطالبات کرتے ہیں اور پھر کہیں جا کر نہیں رکتے، اس سے سب سے پہلا نقصان تو یہی ہو جاتا ہے کہ منگنی کے دوران لڑکی اور اس کے گھر والوں کے دل میں لڑکے والوں کے لئے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سب سے پہلا نفرت کا بیج ہوتا ہے جو ہم اپنے ہاتھوں بوتے ہیں، جب لڑکی والے جیسا تیسا کر کے ان کے مُطالبات پورے کر دیتے ہیں تو پھر بھی ہر وقت لڑکے والوں کی طرف سے یہی تاثر ملتا رہتا ہے کہ ہم

پورے طور پر مُطمئن نہیں ہوئے اور دوسروں کے قصّے سنا کر یہ تأثر دیا جاتا ہے کہ ہمیں بہت ہی کم ملا ہے، یہ باتیں سن کرلڑکی اور اسکے گھر والے کڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح وہ نفرت کا بیج تناور درخت بن جاتا ہے، آپ ایمانداری سے بتائیں کہ عامل سے کیسے کاٹیگا۔

پھرلڑکی بیاہ کرسسرال چلی جاتی ہے، اس وقت لڑکے کو پوری صورتِ حال کا پتہ چلتا ہے، ایسی صورت میں اس کے دل میں اسکے والدین سے نفرت کا پہلا بیج داخل ہوتا ہے۔

جب ماں کوخصوصاً پتہ چلتا ہے کہ بیٹا اپنی بیوی کی طرف مائل ہورہا ہے تو وہ پہلے حملے کے طور پر بیوی کی شکایات بیٹے کو کرنا شروع کرتی ہے، اس کھیل میں بیٹیاں بھی شریک ہوجاتی ہیں، اب گھر ایک تماشہ بن جاتا ہے ۔وہ بچہ جس کو ان ہی والدین نے بڑی محنت اور پیار سے پالا تھا، ان ہی کی ناعاقبت اندیشیوں سے ان کا دشمن بن جاتا ہے ۔اب عامل کا کردار شروع ہوتا ہے، اس وقت کچھ بھی ان میں عقل اور خوفِ خدا ہوتا تو وہ ہرگز ہرگز عامل کے پاس نہ جاتے اور اپنی غلطیوں پر غور کرتے اور شریعت کی طرف رُجوع کرتے تو ساری مصیبت سے نکل آتے، نہ بچے سے ہاتھ دھونے پڑتے اور نہ آخرت خراب ہوتی۔ مجھے سب سے بڑا تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ یہی ساس جب بہو تھی، ان سارے مسائل سے گزری تھی، پھر بھی وہ سب کچھ بھول کر وہی غلطی دوہرا رہی ہوتی ہے ۔اب آپ اس معاملہ کو ذرا سا الٹا کر کے دیکھ لیں یعنی اگر ساس کی باتوں میں آکر اگر شوہر بیوی

کے خلاف ہوجائے تو وہ بیچاری سیدھی عامل کے پاس پہنچ جائیگی اور تعویذ گنڈے اس کو پلانا شروع کردے گی، یہ ایک جادوئی چکر ہے جوان کے درمیان چلتا رہتا ہے۔

اب ہمیں کیا کرنا چاہئے

جب آپ بچہ کا رشتہ کرنا چاہیں تو سب سے پہلے اپنے دل سے جہیز و پگڑی وغیرہ کی خواہش کو دل سے بالکل نکال دیں، صرف اور صرف دل میں یہی خواہش ہونی چاہئے کہ ہم اپنے گھر میں ایک بیٹی لا رہے ہیں اور ہمارے بیٹے کی جو ذمہ داری ہمارے اوپر تھی، اسے پوری کررہے ہیں، یہی سنت کی ادئیگی ہے۔ اگر اس طرح نہیں تو پھر یہ تجارت ہے جو سنت کے نام پر کی جارہی ہے، جس کے بارے میں یقیناً ہم سے پوچھ ہوگی۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ صرف ایک بچہ کی شادی بے غرضانہ طریقہ پر کر کے دیکھ لیں، پھر دیکھیں کہ گھر کیسا جنت بنتا ہے، کس طرح بہو آپ سے محبت کرتی ہے اور کس طرح بیٹا آپ کی پیشانی چومتا ہے۔ محبتیں عملوں سے پیدا نہیں ہوتیں، حقیقی اخلاقیات سے پیدا ہوتی ہیں، محبت دلوں میں ڈالنا صرف اللہ رب العزت کا کام ہے اور اس سے بغاوت کرنے کے بعد یہ امید رکھنا کہ چند اوراد اور وظائف رٹنے سے محبت پیدا ہوجائے، نری جہالت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر آپ محبت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو میٹھے بول اپنی بہو ہی سے بول لیں اور بہو کو چاہئے کہ وہ دو میٹھے بول اپنی ساس سے بول لے تو یہی سب

سے بڑا وظیفہ ہے۔

یہاں میں ایک بات صاف صاف یہ بھی کرونگا کہ اس میں عورت کا قصور تو ہے ہی مگر مرد کا قصور بھی کچھ کم نہیں، اگر وہ گھر کا کفیل ہے اور بڑا ہے تو وہ اپنا پورا کردار ادا نہیں کرتا، وقت سے پہلے اسے اپنے گھر میں ایسا ماحول بنانا چاہیئے تاکہ آئندہ جب شادی بیاہ کے مراحل آئیں تو گھر والوں کے ذہن بنے ہوئے ہوں اور گھر میں عورت کی جو ذات رہتی ہو، اس کے سامنے یہ بات کھول کر بیان کردی جائے کہ رشتوں میں تجارتی ذہن کا کوئی دخل برداشت نہیں کیا جائیگا، اگر اس طرح چراغ سے چراغ جلتا گیا تو آپ کی اپنی بیٹی بھی جہاں جائیگی خوش رہے گی۔

دوسرا مسئلہ بیٹی کے اچھے رشتہ کا

یہاں پر بھی انسان بہت پریشان ہوتا ہے اس میں ذرّا برابر بھی شک نہیں کہ یہ ہمارے معاشرے کا بہت اہم مسئلہ ہے، لیکن کبھی یہ بھی دیکھا کہ اس پریشانی میں قصور کس کا ہے اور کیا اس کا حل ہمارے خود کے ہاتھوں میں ہے؟ یا یہ کہ عامل کے پاس ہے؟ اوپر میں نے ایک لڑکی کا ذِکر کیا ہے، جو یہ ڈھونگ کرتی تھی کہ گویا اس پر جن کا سایہ ہے جب کہ وہ اپنی مرضی کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ خیر میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو ہمارے معاشرے میں غلط رِیت و رِواج چلا ہوا ہے کہ لڑکی کا اگر کوئی رشتہ آئے تو ہم اسکو دینگے، ورنہ اس کے رشتہ کا انتظار کرتے رہیں گے، چاہے اس بیچاری کی پوری

زندگی اسی انتظار میں گزر جائے، پھر گھر کی عورتیں اس معصوم بچی کو عاملوں کے پاس لئے لئے پھرتی ہیں۔ آپ بھی اور میں بھی اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ پھر ان ظالم عاملوں کے ہاتھوں ان معصوم بچیوں کا اکثر کیا حال ہوتا ہے۔ ایک دفعہ میں خود ایک عامل کا لمبا چوڑا بورڈ پڑھ کر اسے دیکھنے کے لئے گیا، وہ ایک نوجوان خوبصورت عامل تھا، پینٹ شرٹ پہنے ہوا تھا اور اس نے الگ سے ڈاکٹروں کی طرح ایک مُعائنہ رُوم بھی بنایا ہوا تھا، اس میں ایک صوفہ ٹائپ کی پلنگ بھی تھی جہاں وہ ضرورت پڑنے پر اور موقع پڑنے پر کیا کچھ کرتا ہوگا، آپ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں، خدا کی خاطر اب ہم باز آجائیں۔

رشتہ کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے

اگر کسی وجہ سے بچی کا رشتہ جلدی آتا نظر نہ آتا ہو تو اسکا صحیح حل بھی شریعت کی طرف رجوع ہے۔ وہ اس طرح کہ ہم خود سب سے پہلے تو اپنے رشتے داروں میں کسی صحیح بچے کو دیکھ لیں اور آگے بڑھ کر اپنی بچی کے لئے رشتہ مانگ لیں، اگر یہ مُمکن نہ ہو تو اِرد گرد دوستوں میں پڑوس میں یا پھر ضرورت کے طور پر ان دونوں گروپوں کے باہر بھی دیکھا جا سکتا ہے، اس میں شرمانے کی کوئی ضرورت نہیں، کبھی کبھار بچی سے بھی پوچھا جا سکتا ہے اور غور کیا جا سکتا ہے ورنہ بعض دفعہ بڑی بدنامی اٹھانی پڑتی ہے۔

آپ پوچھیں گے میں ایسی باتیں کیسے کر رہا ہوں؟ میرا جواب یہ ہے

کہ میرے پاس اس کی مضبوط بنیاد ہے جس کا ذِکر میں اپنی کتاب ''نکاح وطلاق'' میں بھی کر چکا ہوں۔ وہ بنیاد یہ ہے کہ اگر ہم صحابہؓ کے طرزِ عمل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں وہاں پر لڑکی کے لئے رشتہ مانگنا معیوب نظر نہیں آتا۔ سب سے پہلے آپ قُرآن مجید کو دیکھیں، حضرت لوطؑ اپنی قوم سے فرماتے ہیں کہ اے میری قوم! تم برائیوں میں کیوں مبتلا ہوتے ہو اور میری قوم کی بیٹیوں سے کیوں نکاح نہیں کر لیتے۔ پھر رسول ﷺ حضرت عثمان غنیؓ سے فرماتے ہیں عثمانؓ! میں نے تم کو میری دوسری بیٹی دے دی پہلی کے انتقال پر۔ اب دوسری کے انتقال پر کہتا ہوں کہ اگر تیسری بھی ہوتی تو تمہیں دے دیتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو آپ ﷺ کو نکاح کے لئے پیش کیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ آپ ﷺ کو نکاح کے لئے پیش کیا۔ اس طرح وہاں ایک عام رواج بن گیا کہ مرد کے لئے بھی رشتے مانگے جاتے تھے اور عورتوں کے لئے بھی مانگے جاتے تھے اور اس طرزِ عمل کو قطعاً معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ میں کہونگا کہ آج بھی آپ کسی عرب علاقہ میں تو چلے جائیں تو آپ کو یہی طرزِ عمل ملے گا، مگر افسوس خصوصاً ہندوستان اور پاکستان میں لڑکے کا رشتہ مانگنا آج بھی معیوب سمجھا جاتا ہے، اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ ہماری بچیاں بغیر بیاہی بیٹھی ہیں اور جو کام ہم بآسانی کر سکتے تھے اس کام کو ہم عاملوں سے کروانا چاہتے ہیں۔

حضرت صوفی صاحبؒ کا وِصال

جیسا کہ میں نے مندرجہ بالا سُطور میں حضرت کے حج کے سفر کا ذِکر کیا ہے۔ حضرت اس اپنے آخری حج ہی میں بڑے کمزور نظر آرہے تھے، فرماتے تھے کہ مجھے Suger کے مرض نے نِڈھال کر دیا ہے، اسلئے حضرت کی بینائی بھی کافی مُتأثر ہوگئی تھی۔ حضرت جہاں ایک انتہائی خوش لباس اور حسین وجمیل انسان تھے، خوش ذائقہ بھی تھے، اس لئے میٹھی چیزیں بھی زیادہ پسند فرماتے جس نے شوگر کے مرض میں مزید اضافہ کردیا، آخر میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ ہاضمہ بھی مُتاثر ہوگیا تھا اور پاؤں بھی سُن رہنے لگے تھے۔ ان ہی دنوں حضرت کے پاؤں میں ایک مرتبہ چوٹ لگ گئی جس کا حضرت کو احساس نہیں ہوا اور کافی خون بہہ گیا، انتقال سے دو دن پہلے غنودگی اور غشی تاری رہی مگر اسی حالت میں جب بھی ہوش آتا، فرماتے کہ مجھے وضو کراؤ، میں نماز پڑھونگا اور لیٹے بیٹھے نماز کے لئے ہاتھ باندھ کر ''اللہ اکبر'' کہہ اٹھتے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آگیا جو سب پر آنا ہے، آخر کار اتوار اور پیر کی درمیانی شب رات ۲؍رجب ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۳؍جولائی ۱۹۷۵ء کو وہ عابد و زاہد اور ذاکر و شاغل بزرگ اس فانی دنیا کو چھوڑ کر اپنے مالکِ حقیقی کے پاس پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطاء فرمائے، آمین۔

2: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

جن دنوں ہم حضرت صوفی صاحبؒ کی صحبت اِختیار کے ہوئے تھے، انہی دنوں حضرت صوفی صاحبؒ ہی کی ترغیب سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی مجلس میں شرکت کرنے لگے، حضرت ان دنوں دارالعلوم کراچی نانک واڑہ میں مجلس فرماتے تھے، مجلس بڑی پورنور ہوتی تھی، عامۃ النّاس کے علاوہ زیادہ تر سنجیدہ لوگ مجلس میں شریک رہتے، اس میں حضرت سوالوں کے جوابات کے علاوہ خود اپنی طرف سے بھی وعظ ونصیحت فرماتے، اس قدر پُر وقار مجلس ہوتی تھی کہ پھر ایسی مجلس دیکھنے کے لئے آنکھیں آج بھی ترس رہی ہیں۔ نانک واڑہ کے بعد حضرت نے اپنی مجلس کا سلسلہ لسبیلہ میں بھی شروع فرمایا تھا جو کراچی کا ایک اور مشہور محلّہ ہے۔ حضرت جب بھی علمی باتیں کرتے اور علمی نکات بیان فرماتے، اس وقت ایسا لگتا جیسے علم کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اُمنڈ رہا ہے نکات علمی ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر عام فہم بھی ہوتے کہ ہر خاص و عام اسے بآسانی سمجھ لیتا، بعض دفعہ حضرت کوئی ایسا نکتہ بیان فرماتے جس سے لوگ سبحان اللہ پکار اٹھتے، اس وقت حضرت کا ایک مخصوص انداز دیکھا جو بعد میں کہیں نہیں دیکھا، وہ یہ کہ حضرت

ایسے موقع پر فوراً قرآن مجید کی یہ آیت تِلاوت فرماتے:

سُبْحَانَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ۔

بے شک اللہ تعالیٰ تو بُلند و بالا ہے اور یہ کہ ہمارے پاس کوئی عِلم نہیں مگر جتنا کہ تو نے عطاء فرمایا اور تو عِلم اور حِکمت والا ہے۔

کبھی ان کو اپنی بڑائی کرتے نہیں دیکھا، حضرت کو خودستائش سے گویا نفرت سی تھی، حضرت انتہائی مُتواضع انسان تھے مگر تھے وضعدار۔ ماشاء اللہ۔ چہرے پر بڑا رعب تھا، ہر کسی سے بڑی انکساری سے ملتے، ہم سب دوست اس زمانے میں جوان تھے، حضرت سب دوستوں سے بڑی محبت فرماتے، بلکہ میں یہ بات بلا ترّدد کہہ سکتا ہوں کہ جب بھی ہم سب دوست حضرت کے پاس کورنگی کے دارالعلوم میں جاتے تو پدرانہ محبت ملتی، چائے بسکٹ سے ہم لوگوں کی تواضع بھی ہوتی، کبھی ہم سب دوست حضرت سے تخلیہ میں وقت مانگتے تو فوراً راضی ہو جاتے۔ مجھے خود ایک دفعہ چند مسائل معلوم کرنے تھے تو حضرت نے مجھے پورے ایک گھنٹے کا وقت دیا اور بڑی محبت اور شفقت سے مشورے دئے۔

ایک طرف ہم حضرت صوفی صاحب ؒ کی صحبت میں ذِکر وشُغل میں مصروف تھے تو دوسری طرف حضرت مفتی صاحب ؒ کی صحبت میں علمی بلوغت

آ رہی تھی، میں قسم کھا کر عرض کرتا ہوں کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی مجلس میں دل کے اندر ایک نور پیدا ہوتا تھا جس کو ہم سب دوست پورے طور پر محسوس کرتے، حضرت زیادہ تر موت کا ذِکر نہ فرماتے مگر جوانی میں ہمیں ان کی مجلس میں ایسا محسوس ہوتا کہ موت سامنے کھڑی ہے، اس کیفیت کی وجہ سے گناہ خود بخود چھوٹنے لگے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم جتنے بھی دوست حضرت کی صحبت میں جاتے تھے، تقریباً آج سب ہی زندہ ہیں اور ساٹھ کے پیٹے میں ہیں، مگر ماشاء اللہ ان کی صحبت کی برکت سے سب ہی دین دار ہیں، اور دین دار بھی صرف نماز روزے والے نہیں بلکہ ان سب کے معاملات بھی ٹھیک ٹھاک درست ہیں، حضرت کی تعلیم ہی یہ تھی، حضرت معاملات کی درستگی پر بڑا زور دیتے اور اس سے کم پر کبھی راضی نہ ہوتے، ان کی صحبت میں ماشاء اللہ ہمیں وہ گوہر ملے جو ہماری بعد کی زندگی میں مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔

حضرت کی سب سے بڑی خوبی ان کی اعتِدال پسندی اور حق و انصاف کی بات کرنا تھا، اہلِ خبر سے پوشیدہ نہیں کہ ایوب خان اور فاطمہ جناح کے اِلیکشن کا معرِکہ کس بلا کا تھا، ان دنوں حضرت سے لوگ پوچھتے کہ کس کا ساتھ دینا چاہیے تو حضرت بڑا نپا تُلا جواب دیتے، جس میں جو خوبی اور خامی ہوتی بیان فرما دیتے اور حالات اور پُروپیگنڈے سے ذرّہ برابر بھی مُتاثر نہ ہوتے، ان ہی دنوں مولانا مودودیؒ اور جماعتِ اِسلامی کا بھی بڑا طوطی بول رہا تھا، کیوں کہ اِلیکشن کا زمانہ تھا، جس میں ایوب خان کے

خِلاف جماعتِ اِسلامی بھی پیش پیش تھی، چونکہ جماعتِ اِسلامی ایک مُنظّم سیاسی اور دینی جماعت تھی جو مُخالف سیاسی جماعت کے لئے یقیناً خطرہ تھی، اس لئے مُخالف کیمپ سے جماعتِ اِسلامی پر بڑے رکیک حملے ہوتے تھے اور یہ سارے حملوں کا مَحور مولانا مَودودی کا لِٹریچر ہوتا تھا، کیوں کہ جماعتِ اِسلامی مولانا مَودُودیؒ کے سِوا کچھ بھی نہیں تھی، ان حالات میں جن میں مولانا مَودُودیؒ کی تحریروں سے تقریباً علماءِ کرام نالاں تھے، لوگ حضرت مفتی صاحبؒ سے مَولانا مَودُودیؒ کے بارے میں استفسار کرتے کہ حضرت! آپ کا سید مَودُودیؒ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ حضرت مفتی صاحبؒ جو حق و انصاف کے پیکر تھے، فرماتے کہ دیکھو بھائی! انھوں نے چند مُفید مضامین بھی لکھے ہیں، ان کو سراہنا چاہئے، اور ایک دفعہ انھوں نے ان کی چند تصانیف کا ذِکر بھی فرمایا، مثلاً ان کی کتاب ''سود''، ''ضبط تولید'' اور سُنّت کی آئنی حیثیت اور مسئلہ قادیانی وغیرہ قابلِ ذِکر ہیں، حضرت فرماتے تھے کہ میں اپنے دارالعلوم کے بچوں کو بھی ان کتابوں کے پڑھنے سے منع نہیں کرتا، البتہ وہ فرماتے کہ سید مَودُودیؒ صاحبؒ اپنی دوسری تحریروں میں علماءِ اہلِ سُنّت کی راہ کو چھوڑ گئے ہیں جن سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ ہم نے سید مَودُودیؒ سے کہا کہ نوجوانوں کو دین کی طرف راغِب کرنے کا جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے وہ یقیناً مُفید ہے، مگر آپ انھیں مسجد میں لاکر الجھا دیتے ہو، بس باہر کا کام آپ کرو اور پھر مسجد میں ہمارے حوالے کر دو۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کو جزاءِ خیر عطا فرمائے، وہ کتنے عادل اور

انصاف پسند انسان تھے، اب ایسے لوگ کہاں؟ البتہ بعد میں سید مودودیؒ نے اپنی کچھ اور تحریریں لکھیں جن میں صحابہؓ کی تنقیص کا پہلو نمایاں تھا، حضرت بہت رنجیدہ ہوئے اور مولانا مودودیؒ کے بارے میں اپنی پرانی رائے میں کچھ تبدیلی فرمائی جو مندرجہ ذیل ہے:

ایک دفعہ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ میں مدینہ منورہ کی زیارت کیلئے حاضر ہوا، جب مسجدِ نبویؐ میں حاضری کیلئے داخل ہوا تو روضہ رسول ﷺ پر لوگوں کا ہجوم تھا اور وہ والہانہ سلام عرض کر رہے تھے، میں دور ہی رک گیا، دل میں خیال پیدا ہوا اور اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ شفیع تو نے کیا کیا ہے دین کے لئے اور کس منہ سے روضہ رسول ﷺ پر حاضری دے رہا ہے، اگر قریب جائے گا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ آپؐ کی تکلیف کا باعث بنے، اس لئے میں دور ہی سے سلام عرض کرنے لگا۔ اسی اثناء میں کیا دیکھتا ہوں کہ مجھے روضہ رسول ﷺ سے آواز سی آنے لگی کہ

> رسول ﷺ فرما رہے ہیں کہ کوئی میری جالیوں سے چمٹا کھڑا رہے اور میری سنتوں پر عمل نہ کرے وہ مجھ سے دور رہے اور اگر کوئی مجھ سے دور ہو اور میری سنتوں پر عمل کرے وہ مجھ سے قریب ہے او شفیع! تم یہ بات لوگوں تک پہنچا دو۔

حضرت نے جس مجلس میں یہ بات بتائی، میں خود اس مجلس میں موجود تھا، حضرت کی آنکھوں میں آنسو تھے اور حضرت رقت آمیز آواز میں فرما

رہے تھے کہ اگر آپؒ مجھے یہ نہ فرماتے کہ:

او"شفیع! تم یہ بات لوگوں کو پہنچا دو"۔

تو کبھی اس بات کا ذِکر کسی سے بھی نہ کرتا۔ یہ تھا مقام میرے بزرگ اور میرے شیخِ صحبت حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے، آمین۔

ویسے تو حضرت کا علمی کام بے حساب تھا مگر حضرت نے معارفُ القُرآن میں وہ سارے ہی گوہر بکھیر دیئے ہیں جو ان کی جھولی میں تھے، میں یہاں صرف آپ کی علمی پیاس کو کچھ بُجھانے کے لئے صرف ایک ہی علمی پارہ پیش کرتا ہوں جسے پڑھ کر ہر کسی کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت کی علمی نگاہ کتنی گہری اور عمیق تھی۔ حضرت نے مندرجہ ذیل تفسیر قرآنِ مجید کی سورہ بقرۃ کی آیت نمبر ۱۱۱ سے ۱۱۳ کے ضمن میں فرمائی ہے جو مسلمانوں کے تنزّل اور ترقی کے اسباب کے ضمن میں ہے اور ایک نادر نسخہ ہے، اگر کوئی سمجھے تو سب کچھ اسی میں ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

> دوسری اہم بات مسلمانوں کے تنزّل اور پریشانی اور کفار کی ترقی اور آرام کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کا جداگانہ خاصّہ رکھا ہے، ایک عمل کرنے سے دوسرے کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے۔ مثلاً تجارت کا خاصّہ ہے مال میں زیادتی، دوا کا خاصّہ ہے بدن کی صحت، اب اگر کوئی شخص تجارت میں تو دن رات

لگا رہے اور بیماری اور اسکے علاج کی طرف توجہ نہ دے تو محض تجارت کے سبب وہ بیماری سے نجات نہیں پا سکتا، اسی طرح دوا دارو کا استعمال کر کے تجارت کا خاصہ یعنی مال کی زیادتی حاصل نہیں کر سکتا۔ کفار کی دنیوی ترقی اور مال و دولت کی فراوانی ان کے کفر کا نتیجہ نہیں جیسے مسلمان کا اِفلاس و پریشانی اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ کفار نے جب آخرت کی فکر چھوڑ دی اور پوری طرح دنیا کے مال و دولت اور عیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صِنعت، زراعت اور حکومت و سیاست کے مفید راستوں کو اختیار کیا اور مضر طریقوں سے بچے تو دنیا میں ترقی حاصل کر لی، اگر وہ بھی ہماری طرح صرف اپنے اپنے مذہب کا نام لے کر بیٹھ جاتے اور دنیوی ترقی کے لئے اس کے اصول کے مُطابق جدوجہد نہ کرتے تو ان کا کفران کو مال و دولت یا حکومت کا مالک نہ بنا دیتا، پھر ہم یہ کیسے سمجھ لیں کہ ہمارا اسلام اور وہ بھی صرف نام کا، ہماری ساری فتوحات کے دروازے کھول دیگا؟ اسلام اور ایمان اگر بالکل صحیح اصول پر بھی ہو تو اس کا اصلی خاصّہ اور نتیجہ نجاتِ

آخرت اور جنت کی دائمی راحت ہے، دنیا میں مال و دولت کی فراوانی یا عیش و آرام کی وسعت اس کے نتیجہ میں حاصل ہونا ضروری نہیں، جب تک اس کے لئے مناسب جدوجہد نہ کی جائے۔ اور یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ جہاں کہیں اور جب کوئی مسلمان تجارت وصنعت، حکومت وسیاست کے اصولِ صحیحہ کو سیکھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ بھی ان دنیوی ثمرات و نتائج سے محروم نہیں رہتا جو کسی کافر کو حاصل ہورہے ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ دنیا میں ہمارا اِفلاس و احتیاج اور مصائب و آفات ہمارے اسلام کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال چھوڑنے کا اور دوسری طرف ان تمام کاموں سے منہ موڑنے کا نتیجہ ہے جن کے عمل میں لانے سے مال و دولت میں زیادتی ہوا کرتی ہے۔

(معارفُ القرآن جلد نمبر۱، صفحہ نمبر۲۹۴)

حضرت مفتی صاحبؒ نے مندرجہ بالا سُطور میں اس امتِ مُسلمہ کی بیماری کا جو علاج تجویز فرمایا ہے، ایسا علاج تجویز فرمانا کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی، افراط وتفریط کے اس دور میں ہر کوئی مسلمانوں کی ترقی کے جذبہ سے اٹھتا ہے، ایسے میں یا تو وہ دینی اصولوں کو ہی خیر باد کہہ اٹھتا ہے یا پھر ترک

اسباب کو توکل کا نام دے کر مسلمانوں کو غیبی نصرت کا مژدہ سناتا ہے، ایسے میں حضرت کا یہ نسخہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے تریاق سے کم نہیں۔ ہائے افسوس اب زمانہ ایسے لوگوں کو کہاں سے لائے۔

حضرت مُفتی صاحبؒ نے عجیب طبیعت پائی تھی، دین کے معاملہ میں خود تو عزیمت پر عمل فرماتے مگر لوگوں کا ہمیشہ خیال فرماتے اور ان کو اگر دین میں گنجائش ہوتی، سہولت کی بات بتاتے۔ مثلاً ایک دفعہ فرمایا:

> لوگ عورتوں کے پردہ کا مطلب غلط سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ بس انھیں چار دیواری میں بند رہنا چاہئے اور اسی کو پردہ کا صحیح مفہوم سمجھتے ہیں۔ بلکہ جس طرح ہمارا دل ہے اور خواہشات ہیں، ان کا بھی خیال رکھنا چاہئے اور ان کو اتنی راحت پہنچانی چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو قیدی نہ محسوس کریں اور ان کو شرعی حدود میں رکھتے ہوئے تمام مُمکنہ تفریحات کرادینی چاہئے اور اتنی کرادیں کہ وہ خیال کرنے لگیں کہ بے پردہ ہونے کی صورت میں بھی وہ اتنی تفریحات نہیں کرسکتی تھیں جتنی ہم نے پردہ میں کرلیں۔ چنانچہ یہ بھی فرمایا کہ میں نے اپنی اہلیہ کو تمام تفریحی مقامات پردہ ہی میں دکھادیے اور وہاں تک لے گیا کہ انھوں نے خود ہی کہہ دیا کہ یہاں تو

سب خرافات ہی خرافات ہیں، گھر ہی میں رہنا بہتر
ہے، پھر فرمایا کہ ایسا کرنا اپنی وسعت ہی کی حد تک
بہتر ہے۔

اس کے علاوہ حضرت اہلِ اللہ کی صحبت اختیار کرنے پر بھی بڑا زور دیتے اور ایک بڑا اچھا تُلا جملہ استعمال فرماتے، کہتے ''کتاب اللہ کو رِجال اللہ سے سیکھو اور رِجال اللہ کو کتابِ اللہ سے پرکھو'' مطلب یہ ہوتا تھا کہ اللہ والے وہ ہیں جو کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول ﷺ پر پورے اترتے ہوں اور جب ایسے اللہ والے مل جائیں تو پھر ان سے کتاب اللہ کی تعلیم لو، کیوں کہ وہی اس کے اہل ہیں۔ ہم حضرت کی کون کون سی باتیں لکھیں، ایک دو باتیں یا چند باتیں ہوں تو انسان ان کا ذِکر کر سکتا ہے، حضرت کی باتوں کے لئے تو ایک دفتر چاہئے، مختصر یہ کہ

آج ہم جو کچھ بھی ہیں آپ کی عنایت ہے، آپ
سے دعا لی ہے آپ نے دعا دی ہے۔

مُبشّرات

جب حضرت مفتی صاحبؒ کا وصال ہوا تو میں ان دنوں اپنی تجارتی مصروفیات کے سلسلہ میں سعودی عرب مین تھا، مجھے حضرت مفتی صاحبؒ کے وِصال کا پتہ نہیں چلا، مگر چونکہ حضرت سے ایک قلبی تعلق تھا، ایک رات کو خواب دیکھا کہ حضرت کا انتقال ہو چکا ہے اور مَیں روضہ رسول ﷺ پر

حاضر ہوں اور اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مفتی صاحبؒ بھی اسی حجرے میں مدفون ہیں جس میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور خُلفاءِ راشدینؓ مدفون ہیں اور باہر حضرت مفتی صاحبؒ کے لائق فرزند حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ان کی مسند پر بیٹھے ہوئے درس دے رہے ہیں۔ ایسے خواب مؤمن کے مُبشّرات ہوتے ہیں، اس خواب سے حضرت کا مقامِ عالی عالمِ ارواح میں نظر آتا ہے تو دوسری طرف ان کے لائق فرزند حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا علمی مقام بھی صاف نظر آرہا ہے۔

ویسے عقیدت مندوں کو ایسے خواب آنا کوئی نئی بات نہیں لیکن یہاں میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے معاملہ میں یہ بات صحیح نہیں کیوں کہ میں وہ شخص ہوں کہ جب تک کسی کو پورا ٹھوک بجا کر دیکھ نہ لوں عقیدت مند نہیں بنتا، اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت مفتی صاحبؒ تو تھے ہی ایک جلیل القدر انسان مگر آج ان کے فرزندِ ارجمند حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب بھی عالمِ اسلام میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، آج میں نہیں پورا عالمِ اسلام ان کے علمی کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے، خصوصاً غیر سودی نظامِ معیشت کا جو کام انھوں نے کیا ہے، یہ ان ہی کا خاصہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی یہ سعی جلیلہ کو قبول فرمائے، آمین۔ میں نے ان کو قریب سے دیکھا بھی ہے اور پرکھا بھی ہے، ان سے کسی مسئلہ میں رائے لینے کے بعد واقعی انسان دوسروں سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم میں مزید برکت عطا فرمائے، آمین۔

اب میں حضرت کے وِصال کی خبر جو میں نے حضرت مولانا تقی عثمانی

صاحب سے خود سنی تھی مندرجہ ذیل سطور میں پیش کرتا ہوں۔

حضرت مولانا مُفتی محمد شفیع صاحبؒ کا وِصال

حضرت مُفتی صاحبؒ عرصہ دراز سے دل کے عارضہ میں مبتلا تھے مگر دس شوال ۱۳۹۶ھ کو دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اس دن حضرت فجر کی نماز کے بعد اپنے معمولات میں مصروف تھے، فجر کی نماز کے بعد ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوئے، ناشتے کے بعد کا معمول کچھ اس طرح تھا کہ کچھ حضرات آجاتے تھے، حضرت ان کو کچھ وعظ و نصیحت فرماتے اور کے سوالات کے جوابات بھی عنایت فرماتے۔ اس کے بعد کچھ افریقہ کے مہمان آئے ہوئے تھے جو وہیں ٹھہرے ہوئے تھے، ان کو بلایا اور تقریباً دن کے بارہ بجے تک ان سے گفتگو فرماتے رہے۔ اس کے بعد تقریباً سوا بجے ایک فتوے پر دستخط فرمائے۔ کس کو پتہ تھا کہ حضرت اپنی زندگی کے آخری فتوے پر دستخط فرما رہے ہیں۔ اس کے بعد استنجاء اور وضو کے لئے بیت الخلاء تشریف لے گئے، مگر جب وہاں سے فارغ ہوئے تو باہر آنے کے بعد بے انتہا نقاہت محسوس کی اور چارپائی پر نڈھال ہو کر لیٹ گئے۔ حضرت مُفتی صاحبؒ کو ضروری ادویات دی گئیں، اس کے باوجود جب ان کی طبیعت نہ سنبھل سکی، تب ان کے مُعالج ڈاکٹر سید اسلم صاحب سے رابطہ کر کے حضرت کو انجکشن لگوایا گیا، جس وقت انجکشن لگایا جا رہا تھا، اس وقت حضرت مُفتی صاحبؒ نے فرمایا:

اچھا بھائی خدا کے سُپرد۔

آخری نماز

درد اور نقاہت کی وجہ سے اب ظہر کی نماز بھی ادا نہیں فرما سکتے تھے، مگر حضرت نے فرمایا 'مجھے ظہر کی نماز پڑھوادو۔ پھر حضرت نے خود پاک مٹی سے تیمم فرمایا اور قبلہ کی طرف رُخ فرما کر اِشارے سے بمشکل نماز ادا فرمائی، پھر کچھ وقفے کے بعد چونکہ عصر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا، قبلہ رُخ لیٹ کر نمازِ عصر بھی ادا فرمائی، یہ عصر کی نماز حضرت کی آخری نماز تھی، چونکہ پیتھوڈِن کا انجکشن تھا، اس لئے حضرت کو غنودگی ہونے لگی، مغرب سے کچھ پہلے ڈاکٹر سید اسلم صاحب بھی آچکے تھے، ان کے مشورے سے حضرت مُفتی صاحبؒ کو ہسپتال منتقل کر دیا گیا، مگر ڈاکٹر اسلم صاحب وغیرہ نے خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ بہرحال رات کے کوئی بارہ بج کر اُنیس منٹ (۱۲:۱۹) پر یہ فقیہہ اعظم، امت کا مُربی اور علم کا ماہتاب زمین و آسمان کو روتا چھوڑ کر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے اور ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، آمین۔

سکون سا محسوس ہوتا اور ان کی مجلس سے اٹھ کر جانے کا جی ہی نہ چاہتا۔ جب حضرت مجلس میں گفتگو فرماتے تو اتنی شگفتہ اور فصیح ہوتی اور اتنے پیارے پیارے اور جچے تُلے الفاظ استعمال فرماتے کہ ہر کوئی محظوظ ہوئے بغیر نہ رہتا۔ حضرت صاحب تصنیف بزرگ تھے، حضرت نے کافی مفید علمی کتابیں سُپر دِقلم کی ہیں جن کا مُطالعہ ضرور بالضرور کرنا چاہئے۔ حضرت کی مجلس میں ایک شان نُمایاں تھی کہ حضرت جب بھی اکابرینِ امّت کا ذِکر فرماتے تو بڑے ادب اور القاب کے ساتھ ان حضرات کا ذِکر فرماتے اور فرماتے کہ وہ لوگ امّت کا سرمایہ ہیں، اگر ان کا ادب ملحوظ نہ رکھا گیا تو آئندہ نسل کو بڑا دِینی نقصان ہوگا، اور فرماتے کہ نام نہاد تحقیق کے نام پر اگر ان اسلاف پر تنقید کا دروازہ کھول دیا جائے تو بعد میں آنے والوں میں اتنا دم خم نہیں کہ امّت کو لے کر چل سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت قاری صاحبؒ کی سوچ بہت گہری اور عمیق تھی اور کیوں نہ ہوتی؟ ان لوگوں کی تربیت ہی اس صدی کے سب سے بڑے مُجدّد اور مُصلح حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے یہاں ہوئی تھی۔

ان جگمگ جگمگ تاروں میں آفتاب کا عالم کیا ہوگا۔

حضرت کی مجالس کی چند علمی باتیں

جن مجالس اور سوال جواب کا ذِکر میں مندرجہ ذیل سُطور میں کرنے

حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحبؒ

حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم دیو بند کے مہتمم تھے اور ۱۹۶۰ء کے عشرے میں پاکستان کے تبلیغی دورے پر آتے رہتے تھے، اس وقت وہ کراچی میں مُخیر حضرات کی دعوت پر آتے اور وعظ و نصیحت فرماتے اوران کی نجی نشستیں بھی ہوتیں۔ کبھی وہ پاکولا والوں کے یہاں قیام فرماتے اور کبھی قاری ظاہر قاسمیؒ کے یہاں ان کا قیام ہوتا، وہ جب بھی تشریف لاتے ہم سب ہی دوست ان کی زیارت کے لئے حاضر ہوتے اوران کا کوئی وعظ سنے بغیر نہ چھوڑتے، کچھ وعظ ہم دوستوں نے بھی مل کر اپنے اپنے محلوں میں رکھوائے تھے۔ حضرت اتنے بڑے بزرگ اور عالم دین تھے جن کی مثال ملنی مشکل ہے مگر اسی قدر مُتواضع اور مُنکسرُ المزاج تھے، ہر کس و ناکس کی بات سنتے اور اس کو جواب دیتے اور بڑی محبت سے پیش آتے۔ حضرت بڑے قادرُالکلام تھے، جب وعظ فرماتے تو ایک سماں سا بندھ جاتا، ان کی زبان سے جو الفاظ ادا ہوتے، ان میں ایسا ربط اور تسلسُل ہوتا کہ سُننے والے کو یہ محسوس ہوتا کہ گویا حضرت پہلے سے لکھی ہوئی کوئی کتاب پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ ان کی مجالس بڑی نورانی ہوتیں، بیٹھنے والوں کو دل میں ایک

جارہا ہوں، ان میں میں خود شریک رہا ہوں، اس لئے اسی لطف و چاشنی کے ساتھ سنا رہا ہوں۔

ا۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت! قُرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہونگے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں قبضہ فساق و فجار کا ہے، اس آیت کو ہم کس طرح سمجھیں؟

جواب۔ حضرت نے ایک گہری آہ بھری اور فرمایا کہ بات تو تمہاری صحیح ہے مگر سمجھ کا فرق ہے، پھر آپ سوال کرنے والے کی طرف متوجہ ہوئے اور اِس سے پوچھا کہ بھائی! اپنے باپ کے شرعی وارث تو تم ہی ہونا؟ اس نے جواب دیا یقیناً۔ جواب میں حضرت نے فرمایا دیکھو! اگر آپ اپنے والد کے شرعی وارث ہونے کے باوجود ان کا کاروبار نہ دیکھو اور غلط لائن پر نکل جاؤ اور اس دوران کوئی غیر وارث آپ کے والد کے کاروبار پر قبضہ جما لے تو کیا وہ وارث کہلانے کا حقدار ہوگا یا یہ کہ آپ ہی قانوناً اور شرعاً وارث کہلانے کے مُستحق ہونگے؟ اس نے برجستہ کہا کہ وارث تو میں ہی رہونگا۔

حضرت نے فرمایا! اسی طرح اس زمین کے اصلی وارث تو تم ہی ہو مگر تم نے اپنی ذمہ داریوں کو نہیں نبھایا، اس لئے فجار و فساق نے قبضہ جما لیا ہے۔ تم آج اپنی ڈیوٹی پر واپس آجاؤ اور کل اپنا حق لے لو، اللہ کا وعدہ صالحین سے ہے اور فرمایا کہ چند لوگوں سے کچھ نہیں ہوتا، صالحین کی کثرت چاہئے۔ ماشاء اللہ حضرت کا جواب سن کر پوری مجلس حیران رہ گئی اور سب کی سمجھ میں آگیا کہ مسلمانوں کے غلبہ نہ ہونے کی اصل وجہ کیا ہے۔

۲۔ایک صاحب نے پوچھا کہ حضرت! ایک شخص عربی جانتا ہے اور اسکے ادب ولغت پر عبور رکھتا ہے، اگر وہ قُرآن مجید کی تفسیر اس بنیاد پر کرتا ہے تو کیا حرج ہے؟

جواب۔حضرت نے فرمایا: یہ طریقہ تو کسی دنیوی علم کے لئے بھی روا نہیں رکھا گیا چہ جائیکہ آپ اسے قُرآن مجید کے حق میں استعمال فرمانے کا مشورہ فرما رہے ہیں۔ پھر حضرت نے ان صاحب کو مخاطب فرما کر کہا کہ میں تمہیں صرف اردو کا ایک جملہ کہتا ہوں، آپ مجھے اس جملہ کی مراد بتادیجئے جو میرے ذہن میں ہے، یہ اس لئے کہ اس جملے کا متکلم میں ہوں، پھر حضرت نے فرمایا میرا وہ جملہ یہ ہے۔''کیا بات ہے'' اس شخص نے جواب دیا کہ اس کی تین ممکنہ مرادیں ہوسکتی ہیں۔

ا۔یعنی آپ تعجب کے معنیٰ میں کہہ رہے ہیں کہ 'کیا بات ہے' جسے انگریزی میں Exclamation بھی کہتے ہیں۔

۲۔دوسری آپ کی مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آپ کسی سے پوچھ رہے ہوں کہ 'کیا بات ہے'؟

۳۔تیسری یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ آپ کسی کی شان بیان فرما رہے ہوں کہ بھئی ان کی تو 'کیا بات ہے'؟

حضرت قاری صاحبؒ نے ان صاحب کی مندرجہ بالا تشریح سن کر فرمایا کہ آپ کا اتنی اچھی طرح سوچ کر جواب دینے کے باوجود بھی آپ

دعوے سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان تینوں مرادوں میں میری مراد کیا ہے جب تک مجھ سے نہ پوچھ لیا جائے کہ میں نے اس جملہ یعنی 'کیا بات ہے' کو کس معنی میں بیان کیا ہے، ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو اپنی کتاب اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمائی ہے، اس کی مراد بھی اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمائی ہے، اور یہ بات قُرآن مجید کی بے شمار آیات سے بھی ثابت ہوتی ہے، پھر ہم کسی دوسرے کی مراد کو کیسے اللہ کی مراد مان لیں۔ پھر دیکھو صحابہ کرامؓ سب ہی عرب تھے، آپ سے زیادہ عربی کے ماہر تھے، قُرآن ان کے سامنے نازل ہو رہا تھا مگر قُرآن آپ ﷺ سے ہی سمجھتے تھے، کسی نے اپنی مراد اور تشریح بیان نہیں کی، پھر میں اور آپ کس گنتی میں ہیں۔

ماشاء اللہ جن صاحب نے سوال کیا تھا پورے طور پر مطمئن ہوگئے اور عرض کیا کہ حضرت! واقعی یہ باتیں مجھے کتابوں سے سمجھ میں نہیں آتی تھیں جو آپ نے چند لمحوں میں سمجھا دیں۔

یہ ہیں فوائد صحبتِ ابرار کے اور اللہ والوں کی صحبت میں رہنے کے، کیوں کہ وہ حضرات چند لمحوں میں جو عقدہ کھولتے ہیں وہ سالوں میں ان کے بغیر نہیں کھل سکتا۔

۳۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت! یہ جو کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہے اور پھر بھی کہیں ایک جگہ نہیں اس کو کس طرح سمجھیں؟

جواب۔ حضرت مسکرائے اور فرمایا کہ یہ تو بڑی آسان سی بات ہے،

بس تم اپنے جسم کو ایک کائنات سمجھو، اگر میں تم سے پوچھوں کہ 'تم کون ہو؟' تو مثلاً تم مجھے کہتے ہو کہ 'میں زید ہوں' پھر میں پوچھوں کہ 'زید کہاں ہے؟' تو تم اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ 'یہ ہے' پھر میں کہوں کہ 'یہ تو تمہارا سینہ ہے'۔ اسی طرح تم اپنے جسم کے مختلف اعضاء پر ہاتھ رکھتے جاؤ اور کہتے جاؤ کہ یہ میں ہوں اور میں جواباً یہ کہتا جاؤں کہ یہ تو تمہارا فلاں عضو ہے۔

اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ تم پورے جسم میں ہو مگر اس کے باوجود کہیں ایک جگہ نہیں ہو۔ بس اسی طرح پوری کائنات میں اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے مگر پھر بھی کہیں ایک جگہ نہیں۔ اور فرمایا کہ میرے اس جواب سے میرا مقصود تمہیں اس دقیق مسئلہ کی تفہیم کے قریب کرنا ہے، اس کے بعد مزید تفہیم کے لئے فرمایا دیکھو! ہر چیز اسکی ضد سے پہچانی جاتی ہے، مثلاً آپ دن کو اس لئے پہچانتے ہیں کہ رات آتی ہے، ٹھنڈک کو اس لئے جانتے ہیں کہ مقابلہ میں گرمی ہے، بس میری اس بات کو غور سے سنو اور بڑے غور سے سنو کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ اور ابد سے ہے، اس لئے تمہیں اس کے عدم کا ادراک نہیں اور نا ہی ممکن ہے، یہ ایک دقیق مسئلہ ہے۔

جن صاحب نے سوال کیا تھا وہ ایک پڑھے لکھے انسان تھے، اس جواب سے سر دھُننے لگے کہ اور عرض کرنے لگے واقعی اہلِ اللہ کے بغیر کتابی علم ناقص ہے۔

یہ تھے حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ جو خود بھی نورانی تھے اور ان کی

مجلس بھی نورانی۔ واقعی آج بھی جب ان کی مجالس کا تصوّر ذہن میں آتا ہے تو روح میں گرمی سی آجاتی ہے، ان کی باتیں بہت ہیں مگر طوالت کے ڈر سے اس موضوع کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم ارواح میں ان کو عالی مقام عطا فرمائے اور جنت الفردوس کا وارث بنائے، آمین۔

حضرت مولانا سعید احمد خان صاحبؒ

حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ کی شخصیت اہلِ علم اور اہلِ حق میں اتنی جانی پہچانی اور مشہور و معروف ہے کہ تعریف کی چنداں محتاج نہیں۔ میں ان صفحات میں دراصل حضرت کا تعارف پیش کرنے نہیں جا رہا بلکہ زندگی کے وہ گوشے اجاگر کرنے جا رہا ہوں جن گوشوں کا تعلق یا تو مجھ سے ہے یا پھر ان کی شخصیت کی عظمت سے ہے، جن کو جان کر یقیناً لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔

ویسے تو حضرت کا نامِ گرامی تبلیغِ دین کے حوالے سے بڑا مشہور و معروف تھا اور کراچی کی مکی مسجد میں ان کی آمد مکہ معظمہ سے رہتی تھی، اس لئے مصافحہ کی حد تک اور وعظ و نصیحت سننے کی حد تک تو حضرت سے میں واقف تھا، مگر حضرت کو قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے سعودی عرب میں قیام کے دوران ملا۔ یہ ۱۹۷۱ء کے اوئل کی بات ہے، جنوری کا مہینہ تھا، میں ان دنوں حجِ بیت اللہ کی سعادت کے لئے حاضر ہوا تھا۔ مکہ مکرمہ میں میرا قیام معلم مکی مرزوقی کے یہاں تھا جو آج بھی مکہ شریف میں محلّہ شامیہ میں اپنا دفتر اور کچھ مکانات رکھتے ہیں۔ خیر ان دنوں حرم شریف میں حضرت

مولانا سعید احمد صاحب تبلیغی جماعت کا حلقہ لگاتے، جس میں میں بھی شریک ہوتا اور حضرت کی پیاری پیاری باتیں سنتا، پھر ان ہی دنوں مکہ معظّمہ کے محلّہ حفائیر میں ایک مسجد میں شب جمعہ بھی ہوتا تھا، میں اس میں بھی شریک رہتا اور وہاں بھی حضرت کی باتیں سننے اور صحبت میں رہنے کا موقع ملتا۔ بس یہ چند شروع کی ملاقاتیں تھیں جو اتنی کافی تھیں کہ ہم کو حضرت کا عاشق بنا گئیں۔ حضرت اتنے سادہ اور منکسر المزاج تھے کہ ان کی یہ صفت بیان نہیں کی جاسکتی، صرف برتی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ میں حج بیت اللہ کے لئے حاضر ہوا تھا اور درمیان میں حضرت سے ملاقاتیں اور تعارف ہوگیا، یہ میرے لئے ایک اعزاز سے کم نہیں تھا۔ خیر حج کے لئے روانگی میں ابھی کچھ دن باقی تھے، ایسے میں مجھے پتہ چلا کہ حضرت مولانا سعید احمدؒ اور تمام اکابرینِ تبلیغی جماعت اپنا حج معلّم مکی مرزوقی کے ہمراہ کرینگے، جس پر میری خوشی کی انتہا نہ رہی، میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ چلو اب ان بزرگوں کا ساتھ عرفات اور منیٰ میں بھی رہے گا جو میرے لئے سونے پر سُہاگا تھا۔ بہرحال عرفات کی وہ مبارک گھڑیاں آگئیں۔ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم رہا ہے، ظہر کی نماز کا وقت تھا، خیمہ میں تبلیغی جماعت کے تمام بزرگ جلوہ افروز تھے، پہلی صف میں اس امّت کا سب سے زیادہ درد رکھنے والے اور امّت کی معمولی سی تکلیف پر چیخ اٹھنے والے شیخ حضرت مولانا زکریا صاحبؒ معروف بحضرت شیخ الحدیثؒ سر جھکائے تشریف فرما تھے۔ ان کے قریب مولانا انعام الحسن صاحبؒ، مولانا

حاجی عبدالوہاب صاحب اور ان کی بغل میں حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ تشریف فرماتھے، اور اسی طرح ہندوستان سے بھی آئے ہوئے کئی اور بزرگ بھی تشریف فرماتھے۔ جنوری کا مہینہ تھا، ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی، بڑا پُر فریب اور روحانی سماں تھا، ابھی کچھ وقت ظہر کی نماز کو باقی تھا، میں یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا کہ مجھے اچانک پہلی صف میں کچھ جگہ نظر آئی، بس پھر کیا تھا، میں فوراً ایک پیاسی ہرنی کی طرح آگے بڑھا اور اس روحانی چشمہ کی پہلی صف میں جا کر بیٹھ گیا۔ظہر کی نماز کا وقت ہوا، اتنے میں حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ اٹھے اور ادھر اُدھر نظر دوڑائی اور مجھ غافل کو بلایا اور فرمایا کہ بیٹا! تم یہاں جوان ہو، ذرا بڑی آواز سے ظہر کی اذان تو دو۔حضرت کا یہ حکم میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھا جس پر میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور حکم کی تعمیل میں فوراً اٹھا اور ظہر کی اذان دی، پھر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ نے ہی امامت کے فرائض انجام دئے۔

ظہر کی نماز کے بعد معلّم کی طرف سے کھانا پیش کیا گیا، پھر وہ تمام مُقدس ہستیاں دعاؤں میں مشغول ہوگئیں۔آج بھی اس پُر نور منظر کا تصور میرے ذہن میں جب بھی ابھرتا ہے تو وہی کیفیت عود کر آجاتی ہے اور اپنی روح میں گرمی سی محسوس کرتا ہوں۔ وہ میرا زندگی کا پہلا حج تھا جو اسقدر مُقدس ہستیوں کے جُھرمٹ میں ادا ہورہا تھا، یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے ممکن تھا۔اس کی سب سے بڑی وجہ میری محترم والدہ کی دعائیں تھیں، جو گھر بیٹھے ہر وقت میرے لئے دعائیں کرتی تھیں۔خیر حج سے فراغت کے

بعد پھر حضرت کے وعظ و نصیحت سننے کے مواقع ملتے رہے، کچھ مکہ مکرمہ میں اور پھر کچھ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران اور اس دوران، حضرت سے اتنا آمنا سامنا رہا کہ حضرت نے مجھے پہچان لیا کہ میں یہاں آتا جاتا ہوں، اس لئے اب میں حضرت کے لئے اجنبی نہیں رہا تھا۔ پھر حج کے بعد میں واپس پاکستان چلا آیا، مگر حرم شریف کی لذت کو بھولا نہیں تھا، اور اس ارادہ سے واپس ہوا تھا کہ کراچی کا کاروبار بند کر کے ہمیشہ کے لئے جوارِ بیت اللہ آجاؤنگا۔ بیت اللہ سے جاتے ہوئے بڑی دعائیں کی تھیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائیں اور کچھ ہی عرصہ کے بعد واپس سعودی عرب آپہنچا اور جدّہ میں اپنا کاروبار شروع کردیا۔ اب کیا تھا، ہر جمعرات کو شب جمعہ میں حفائر مکہ مکرمہ کی مسجد میں حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ سے ملاقات رہتی اور ان کا وعظ و نصیحت سنتا۔

حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ کا یہ معمول تھا کہ رمضان سے محرم الحرام کی ۳۰ تاریخ تک مکہ مکرمہ میں قیام رہتا، پھر حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ مدینہ منورہ چلے جاتے، وہاں بابُ الحوالی میں مسجدِ نور میں حضرت وعظ و نصیحت فرماتے، وہیں حضرت سے ملنے ساری دنیا کے زائرین بھی آتے۔ حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ ہر کسی کی خاطر تواضع کرتے، یہ منظر بھی ایک عجیب منظر ہوتا۔ جس انداز سے حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ لوگوں سے ملتے وہ ایک انوکھا ہی انداز ہوتا، وہ اللہ کے ایسے نیک بندے تھے کہ اپنی راحت کا بالکل خیال نہ رکھتے تھے، ہر کسی سے خندہ پیشانی سے

ملتے۔ اگر کھانے کا وقت ہوتا تو کھانے پر اصرار فرماتے، ورنہ چائے اور پھل کی تواضع سے تو کوئی بھی بچ کر نہیں جاسکتا تھا، فرماتے کہ یہ بیچارے دور دراز سے صرف اللہ کی خاطر مجھ سے ملنے کے لئے آئے ہیں اور میں اپنی راحت کو دیکھتے ہوئے ان کی خاطر تواضع بھی نہ کروں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی وقت کسی فرض نماز کا وقت قریب ہوتا تو حضرت حاضرین کو فرماتے کہ دیکھو بھائی! تم لوگ حج یا عمرہ کے لئے آئے ہو اور تم لوگوں کے پاس محدود اوقات ہیں، اس لئے اپنی نمازیں حرم شریف ہی میں ادا کرو۔ اس لئے نماز سے کچھ پہلے لوگوں کو حرم شریف روانہ کر دیتے، اس میں بھی اس بات کا خیال رکھتے کہ اگر کوئی مقامی شخص ہوتا جس کے پاس اپنی گاڑی ہوتی تو اس سے درخواست کرتے کہ وہ کچھ زائرین کو اپنے ساتھ بیٹھالیں، اس طرح زائرین کو حرم شریف پہنچاتے۔ اکثر میں نے دیکھا کہ حضرت زائرین سے ان کے وطن کے حالات معلوم کرتے، مسلمانوں کی دینی حالت معلوم کرتے، وہاں کی مسجدوں میں تبلیغ کے کام کی نوعیت معلوم کرتے اور وہاں کے علماء اور ائمہ مساجد کے لئے عطر و کھجور کے تحفے بھیجتے اور بعض دفعہ ان کو ان ائمہ مساجد کے نام خطوط بھی دیتے جن میں دین کے کام کی اہمیت اُجاگر کرتے۔

حضرت کی حیات کو دیکھ کر یہ قوی احساس ہوتا تھا کہ الحمدوللہ اس امت کا ایک مُربی ابھی زندہ ہے، چاہے ایک ہی صحیح مگر وہ ہزاروں پر بھاری تھا، ان کا اوڑھنا بچھونا ہی دین کا غم تھا اور حالت یہ کہ انتہائی سادگی، نہ عُجب

نہ دِکھاوا، اللہ کے اس بندے نے عجیب طبیعت پائی تھی۔

اسی طرح حضرت کے دن رات گزر رہے تھے کہ حضرت کو ایک بہت بڑی آزمائش کا سامنا پیش آگیا۔ ہوا یہ کہ پہلی محرم ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۷۹ء کو کچھ شر پسند مکہ مکرمہ میں مسجدِ حرام میں فجر کی نماز کے دوران گھس گئے اور انھوں نے مسجدِ حرام کے سارے دروازے اندر سے بند کر دیئے۔ دراصل یہ ایک سازش تھی، کیوں کہ ان کے پاس بے پناہ اسلحہ تھا اور وہ کئی روز سے اسلحہ اندر تہہ خانے میں جمع کر رہے تھے، ان دنوں حرم شریف زیرِ تعمیر تھا، اس لئے سعودی پولیس خیال نہ کر سکی۔ ابھی مکہ مکرمہ میں کافی حجاج تھے وہ بھی مسجدِ حرام میں بند ہو گئے، مگر جب ظہر تک مطلع صاف ہوا تو پتہ چلا کہ حملہ آوروں نے تمام حاجیوں کو تو باہر نکال دیا تھا۔ اب سعودی پولیس اور ان کے درمیان مذاکرات ہو رہے تھے اور ہر شخص یہ معلوم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ ماجرہ کیا ہے؟ میں بھی ان دنوں مکہ مکرمہ میں ہی تھا، اس لئے ساری کاروائی دیکھنے کا بچشم خود موقع بھی ملا۔ مختصر یہ کہ وہ سارا سیاسی بکھیڑا تھا جس کو دینی رنگ دیا گیا تھا۔ خیر سعودی پولیس نے سترہ دن کی محنت شاقہ کے بعد حرم شریف تو ان حملہ آوروں سے آزاد کروالیا، مگر جس طرح میں نے پہلے ذِکر کیا ہے کہ اسے حملہ آوروں نے حرم شریف پر قبضہ کو دینی رنگ دیا تھا، یہاں تک کہ اس میں ایک صاحب نے تو ''مہدی موعود'' ہونے کا دعویٰ تک کر دیا تھا، اس وجہ سے سعودی عرب میں جتنی دینی جماعتیں کام کر رہی تھیں، وہ سعودی حکومت کی نگاہ میں مشکوک ہوگئیں اور

ان پر پابندی لگا دی۔ اور جو جماعتیں مشکوک نہیں تھیں جیسے تبلیغی جماعت، تو ایسی جماعت کے کام کو بند کرنے کے لئے ان لوگوں نے یہ استدلال کیا کہ چونکہ اس بات کا خطرہ ہر وقت موجود ہے کہ تبلیغی جماعت میں ایسے لوگ پناہ لے سکتے ہیں جو تخریب کار ہوں، چاہے تبلیغی جماعت اس فعل میں شریک نہ ہو، اس لئے آئندہ اس ملک میں انفرادی حیثیت میں کوئی جماعت کام نہیں کر سکے گی۔ اس دلیل پر انھوں نے تبلیغی جماعت کی ساری سرگرمیاں بند کر دیں اور حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ کو وزارتِ داخلہ میں بلا کر تاکید کر دی کہ آئندہ تبلیغی جماعت کی کوئی سرگرمی تا حکم ثانی اس ملک میں نہ ہونے پائے ورنہ اسے جرم تصور کیا جائے گا۔ خیر حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ کے کوئی ایسے سیاسی عزائم نہ تھے سوائے لوگوں کو فکر مند کرنے کے کہ:

> لوگو! اپنی آخرت کی فکر کرو قبل اس کے کہ حساب کتاب کا دن آپہنچے اور تمہارے دامن میں اپنی صفائی میں کہنے کے لئے کچھ نہ ہو۔

مگر چونکہ حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ کا اوڑھنا بچھونا، جاگنا اور سونا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ کھانا پینا بھی دعوتِ دین تھا، بڑے مایوس ہوئے اور بہت ہی رنجیدہ رہنے لگے، اس وجہ سے ان کی صحت بھی کافی متأثر ہوئی، مگر حضرت آخر کرتے تو بھی کیا کرتے ''قہرِ درویش بر جانِ درویش'' کے مشاق اندر ہی اندر گھلنے لگے، بعد میں کچھ بزرگوں کے مشورے پر حضرت نے باہر

ملکوں کے اسفار شروع فرمائے جہاں حضرت کے چاہنے والوں نے حضرت کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور تقریباً حضرت نے ساری ہی دنیا کے کونے کونے میں جا کر دین کی دعوت پہنچائی اور لاکھوں کے مجمع کو خطاب فرمایا، ایسا لگ رہا تھا جیسے ان سے کسی نے پیار سے کہا ہو:

سعید فکر مت کرو، انھوں نے تمہیں اللہ کے گھر میں اللہ کی بات کرنے سے روک دیا ہے، اب پوری دنیا کو تمہارا گھر بنا دیا جائیگا جہاں چاہو جاؤ اور اللہ کی بات سناؤ۔

اور واقعی ہوا بھی ایسا ہی، مگر پھر حضرت جب اپنے دَوروں سے واپس تشریف لائے تو سعودیہ والوں نے کہا کہ تم باہر جا کر بھی کیوں تبلیغ کرتے ہو، اس سے ہماری بدنامی ہوتی ہے کہ ہم نے تمہیں گھر میں اجازت کیوں نہیں دی جب کہ تم ہمارے شہری بھی ہو۔ اس لئے حضرت سے مطالبہ کیا کہ ہم آپ کی نیشنلیٹی واپس لے لیتے ہیں پھر تم جہاں چاہو واپس جاؤ بلکہ جہاں تک میری معلومات ہیں، حضرت نے خود ہی فرمایا کہ میں دین کی تبلیغ کا کام نہیں چھوڑ سکتا، اگر تم مجھے یہ کام نہ ملک کے اندر نہ ملک کے باہر کہیں کرنے نہیں دو گے تو پھر میں جی ہی نہیں سکتا، اس سے بہتر ہے کہ آپ اپنی نیشنلیٹی ہی مجھ سے واپس لے لیں، میں ہندوستان سے ہجرت کر کے دینی کام کے لئے ہی تو آیا تھا۔ اور فرمایا کہ سنو! میں نے پوری اپنی مدتِ قیام میں اپنی راحت کے لئے کوئی ایک چیز بھی بازار سے نہیں خریدی، مجھے یہاں کیا لینا؟

ہے جاؤ جا کر دیکھو میرے گھر پر تو دروازہ تک نہیں، ایک ٹاٹ ہے جو دروازے پر لٹک رہا ہے، بس مجھے اپنی گھڑی دے دو اور سنبھالو اپنا پاسپورٹ۔ یہ کہہ کر حضرت نے اپنا پاسپورٹ واپس کر دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ کہاں جانا پسند کرو گے؟ جواب میں حضرت نے فرمایا

اِنَّ اَرْضَ اللّٰہِ واسِعَۃٌ

اللہ کی زمین وسیع ہے۔

اس بات کی اطلاع فوراً جنگل کی آگ کی طرح جنرل ضیاء الحق صدرِ پاکستان کو بھی پہنچی، فوراً آبدیدہ ہوگئے، وہ حضرتؒ کے معتقدین میں سے تھے، فوراً پاکستانی سفارت خانہ جدہ کو حکم دیا کہ حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ کا پاسپورٹ تیار کرو اور ان کو پاکستان آنے کے لئے پوری سہولیات فراہم کرو۔ اس طرح حضرت بھاری قدموں سے اور پُرنم آنکھوں سے مدینہ مُنورہ سے رخصت ہوئے مگر اس عزم اور ارادہ اور امید کے ساتھ کہ ان کا رب ضرور ان کو یہاں واپس لائیگا۔ حضرتؒ مدینہ مُنورہ سے کتنی محبت اور کتنی عقیدت رکھتے تھے، یہ بھی ایک داستان ہے، بس حضرتؒ تو ہمیشہ زبانِ حال سے یہ فرماتے رہتے کہ

مدینہ کی نسبت ہے قیمت میری
وگرنہ حقیقت میں سستے ہیں ہم

زمین پر مدینہ کی رہتے ہیں ہم
فلک پر مگر ناز کرتے ہیں ہم

اس طرح حضرتؒ ۱۹۸۸ء میں پاکستان تشریف لائے، ایک طرف مدینہ منورہ چھوڑنے کا غم تھا تو دوسری طرف اس بات کی خوشی بھی تھی کہ اب مجھے مدینہ والے رسول ﷺ کے کام سے کوئی نہیں روکے گا۔ پاکستان آنے کے بعد حضرت گویا پورے طور پر کھُل گئے اور دن رات دعوتِ دین میں لگ گئے، تندرست ہوتے یا بیمار ہوتے، ہر حال میں دین کے تقاضہ کو لبیک کہتے، جب دین کی بات کرنی ہوتی یا کہیں اجتماع کا تقاضہ آجاتا تو صحت کی چنداں پرواہ نہ کرتے، فرماتے کہ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت ہے، مگر حرمین شریف کی واپسی کے لئے ہر وقت بے چین رہتے اور آخر یہ تڑپ بھی کام آئی، وہ اس طرح کہ تبلیغی اجتماع کے لئے حضرت کا قطر اور اِمارات بھی جانا رہتا تھا اور وہاں کی فضا دین کے لئے سازگار ہو رہی تھی، ان حالات کو دیکھ کر وہاں کے امیر بہت مُتأثر ہوئے اور حضرت کے معتقد ہو گئے اور انھوں نے حضرت کو اپنی کفالت میں لے لیا، اب کیا تھا سعودی حکومت انھیں سعودیہ آنے جانے سے نہیں روک سکتی تھی، اس طرح حضرت پھر اپنے مقام پر واپس آپہنچے، چاہے عمرہ اور حج کے ویزوں پر ہی صحیح۔ اس طرح حج اور عمرہ کے سیزن میں حضرت کو پھر وہی بہاریں مل گئیں، عرفات اور منیٰ میں حضرت کے وعظ اور ملاقاتیں پھر سے ہونے لگیں، لوگ پروانہ وار حضرت پر گرتے اور حضرت ان کو تبلیغ کے لئے فکر مند فرماتے۔ ایک دفعہ میں خود حج میں تھا،

پتہ چلا کہ تمام تبلیغی حضرات حج میں شریک ہیں اور خصوصاً حضرت سعید احمد خان رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک ہیں، میں اپنے بیٹوں کو لے کر حاضرِ خدمت ہوا، اس حج میں شدید گرمی تھی، اس لئے تقریباً تمام ہی بزرگ ایک ائیر کنڈیشنڈ عمارت میں مقیم تھے جو منیٰ میں تھی، دیکھا حضرت وہاں نہیں تھے، معلوم ہوا کہ حضرت اس عمارت کے قریب ایک خیمہ میں تشریف رکھتے ہیں جس میں عام حجّاجِ کرام کا ماحول تھا، میں وہاں پہنچا، حضرت نے دیکھتے ہی پاس بٹھالیا اور فوراً ساتھیوں سے فرمایا کہ بھئی جلدی ان کے لئے ٹھنڈا مشروب لے آو دیکھو پسینے میں ڈوب رہے ہیں، حالانکہ خود پسینے میں شرابور تھے، ہماری معذرت کے باوجود بڑے اصرار سے مشروبات پلائے، حالات پوچھے اور دعاؤں کے ساتھ رخصت فرمایا۔ ان کو اس خیمہ میں دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ اِکرامُ المسلمین کا پیکر عام حجّاج سے امتیازی شان سے کیسے رہ سکتا ہے۔ ایک دفعہ مجھ سے کراچی کے حالات معلوم کرتے ہوئے پوچھا کہ فلاں صاحب کو آپ جانتے ہیں؟ میں نے کہا 'ہاں' اور یہ بھی کہا کہ اب وہ کراچی کے اس علاقہ میں نہیں رہتے جہاں حضرت آپ نے ان کو دیکھا تھا، بلکہ اب وہ سوسائٹی کے علاقہ میں منتقل ہو گئے ہیں جو ایک مہنگا علاقہ ہے۔ حضرت نے ایک گہری سانس لی اور فرمایا ہاں بیٹا! جب انسان کے پاس زیادہ مال ہو جاتا ہے تو پھر اسے غریب بستیوں سے وحشت ہونے لگتی ہے۔

ایک دفعہ میں جدہ سے مدینہ منورہ ہوائی جہاز سے جا رہا تھا، ائیر پورٹ پر دیکھا، حضرت بھی مدینہ منورہ کے لئے اسی جہاز سے روانہ ہو

رہے ہیں، فوراً حضرت کے ساتھ ہولیا اور ہوائی جہاز میں ان کے قریب کی سیٹ پر جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ چلو اس بہانے حضرت سے کچھ باتیں ہی ہونگیں، میں نے حضرت سے باتوں ہی باتوں میں یہ شکایت کی کہ حضرت تبلیغی اجتماعات میں جو بیان ہوتے ہیں وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی طویل ہوتے ہیں، اس لئے بعض دفعہ لوگ اُکتا جانے کی شکایت کرتے ہیں اور اس وجہ سے بعض دفعہ مجمع اُکھڑ جاتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ بات تمہاری صحیح ہے اور میں نے خود بھی کچھ حضرات کا دھیان اس طرف کھینچا ہے مگر ایک دوسری مشکل بھی ہے وہ یہ کہ ہمارے پاس مجمع عام لوگوں کا ہوتا ہے جن کو سمجھانے کے لئے کبھی کبھار کچھ واقعات اور قصے بھی بیان کرنے پڑتے ہیں، اس لئے اکثر بیان طویل ہوجاتے ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مقرر کو چاہئے کہ غیر ضروری طوالت سے ضرور بچے تاکہ سامعین کی دلچسپی برقرار رہے جس سے اسکو فائدہ پہنچے۔

اسی طرح حضرت سے ایک دفعہ طوافِ بیت اللہ کے دوران ملاقات ہوگئی، میں نے موقع غنیمت سمجھا اور ساتھ ساتھ طواف کرتا رہا، جب حضرت فارغ ہوئے تو وہیں حضرت سے درخواست کی کہ حضرت میرے لئے دعا فرمادیں، فوراً وہ اخلاق کے پیکر کعبہ شریف کی طرف مڑے اور میرے لئے دعا کرنے لگے۔ وہ کس قدر خلیق انسان تھے واقعی بیان سے باہر ہے۔ دراصل وہ ایک ایسے انسان تھے جن کی نظر میں تبلیغِ دین کے سوا باقی تمام تقاضے ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔

میرے ایک دیرینہ دوست نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ وہ حضرت کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ دورانِ فلائٹ جب کھانے کا وقت ہوا تو میرے دوست نے حضرت سے عرض کی کہ حضرت! آپ اپنی سیٹ کچھ پیچھے کرلیں تاکہ آرام سے کھاسکیں۔ حضرت نے پوچھا میری پچھلی سیٹ پر کون بیٹھا ہے؟ دوست نے عرض کیا حضرت ایک بچہ ہے۔ حضرت نے فرمایا پھر میری سیٹ پیچھے نہ کی جائے، میں اس طرح سکڑ کر کھانا کھالونگا۔ حالانکہ اُن دِنوں حضرت کے پیر میں چوٹ تھی، حضرت نے خود تکلیف برداشت کی مگر یہ گوارہ نہ کیا کہ بچے کو تھوڑی سی بھی تکلیف پہنچے۔ واقعی حضرت اِکرام کے پیکر تھے۔ ایک دفعہ میں مدینہ مُنورہ حاضر ہوا اور رَوضہ رسول ﷺ پر سلام عرض کرنے کے بعد مسجدِ نبوی شریف سے باہر نکل رہا تھا کہ دیکھا ایک صاحب حضرت کو ''وھیل چیئر'' پر لئے باہر آرہے ہیں، اُن دنوں حضرت بیمار تھے اور پیر میں چوٹ بھی تھی، اس لئے چلنے میں دشواری تھی، میں نے آگے بڑھ کر مُصافحہ کرنے کی کوشش کی مگر حضرت نے مُصافحہ نہیں کیا اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا گویا حضرت مجھ سے مُصافحہ کرنا پسند نہیں فرمارہے، میں حضرت کے اس طرح کے برتاؤ سے بڑا متعجب ہوا، سوچ میں پڑگیا کہ حضرت کا یہ رویّہ نا قابلِ فہم ہے، حضرت کبھی ایسا نہیں کرسکتے۔ البتہ حضرت اس بات کو ضرور نا پسند کرتے تھے کہ ان کا ہاتھ کوئی چومے مگر مُصافحہ تو ہم نے ان ہی سے سیکھا تھا، اور آج یہ کیا ہوا؟ میں اسی سوچ کے گرداب میں تھا اور دور کھڑا حضرت کو دیکھ رہا تھا کہ ایک صاحب میرے پاس آئے

اور کہا کہ حضرت نے مجھے آپ سے معذرت کرنے کے لئے بھیجا ہے کہ بھائی معاف کر دینا، میں نے تم سے مُصافحہ تمہاری خاطر ہی نہیں کیا، کیوں کہ اگر کوئی میرے قریب بھی زیادہ آتا ہے تو یہاں کی CID اس کی تفتیش شروع کر دیتی ہے اس لئے آج کل مجھ سے کچھ فاصلہ بنائے رکھو۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب حضرت پر تبلیغ کی پابندی لگی ہوئی تھی۔

مندرجہ بالا سُطور میں میں نے حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ کی زندگی کی ایک دھُندلی سی تصویر پیش کی ہے جو دور سے دیکھی تھی یا اسے یوں سمجھ لیجئے گویا ایک خوبصورت جھیل کا نظارہ دور سے کیا تھا۔ خدا جانے ان لوگوں کے پاس جو اس جھیل کے قریب بستے تھے، کتنی ہی خوبصورت داستانیں ہونگیں اس جھیل کی۔ حضرت نے اپنی زندگی کے لمحات کی بھر پور قدر فرمائی، شاید ایک لمحہ بھی انھوں نے ضائع نہیں کیا، دنیا کے کونے کونے میں گئے اور لوگوں کو ایمان اور عمل کی دعوت دی۔ کون نہیں جانتا کہ جب لوگوں کی دینی حالت کمزور ہوتی ہے تو عصبیت کے عفریت بیدار ہو جاتے ہیں، پاکستان بننے کے بعد یہی کچھ ہوا، ناعاقبت اندیش سیاست دانوں نے اپنی اغراض کی خاطر بھائی کو بھائی سے لڑوادیا، جو لوگ پاکستان کا مطلب کیا ''لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ'' کا نعرہ مار کر پاکستان آئے تھے، ان کو کئی قومیتوں اور فرقوں میں بانٹ دیا۔ چلیئے اگر وسائل کی کمی کی وجہ سے وہ ملک نہ بنا سکے کوئی بات نہیں، لیکن ایک بنی ہوئی قوم کو تو تباہ نہ کرتے، پھر وسائل آجاتے تو قوم اپنے پاؤں پر اُٹھ کھڑی ہوتی مگر بُرا ہو انانیت اور جاہ طلبی کا کہ جو قوم کو

لے کر ڈوب گئی۔

ٹھیک اسی جگہ اور اسی مقام پر ان بزرگوں کی شان اور قدر پیدا ہوتی ہے جنھوں نے بے غرضانہ طور پر اپنی پوری زندگیاں اس قوم کو جوڑنے میں صَرف کر دیں، تبلیغی جماعت کی ان خاموش مساعی اور کوششوں نے اس امتِ مسلمہ کے لئے تریاق کا کام کیا۔ حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ حضرت مولانا الیاسؒ کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے، انھوں نے امت کے مرض کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ جب تک امّت میں وہ اوصاف جو خیر القرون کے لوگوں میں تھے پیدا نہیں ہو جاتے، چاہے وہ اُس شان سے نہ صحیح، یہ امّت اس وقت تک نہیں اُٹھ سکتی ۔ وہ ہمیشہ فرماتے کہ دنیا اور آخرت کی کامیابی کا وعدہ فساق اور فجّار سے تھوڑا ہی کیا گیا ہے، یہ وعدہ تو مؤمنین صالحین سے کیا گیا ہے۔ سچ پوچھئے تو ان حضرات کی بات اس قدر اسی لئے سنی جاتی ہے اور ان کے اجتماعات میں حج کے بعد سب سے بڑے مجمع اسی لئے ہوتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنی مساعی سے اپنی اغراض کو بالکل ہی نکال دیا ہے، وہی پیغمبرانہ سنّت کہ ''ہم تم سے کسی اجر کے طالِب نہیں، ہمارا اجر تو اللہ ربُ العالمین کے ذِمہ ہے''۔

مجھے آج تک یاد ہے کہ جن دنوں حرم مکہ میں تبلیغی جماعت کو تبلیغ کرنے کی اجازت تھی، ان دنوں حضرت سعید احمد صاحبؒ ایک لبنانی نوجوان جسے کو عربوں کے سامنے خطاب کرنے کے لئے کھڑا کر دیتے، وہ بڑے پیارے انداز میں سب سے پہلے تبلیغی جماعت کے تین اوصاف بیان

فرماتا۔

۱۔ يُخرِجونَ بِاَموَالِهِمْ و اَنْفُسِهِمْ

اپنے مال اور جان سے نکلتے ہیں۔

۲۔ لَا يَنزِلُونَ اِلا فِى بُيُوْتِ اللّٰه

وہ صرف مساجد میں قیام کرتے ہیں۔

۳۔ لِيسَتْ مَقَاصِدُهُمْ اِلّا دَعْوَةَ اِلَى اللّٰه

اللہ کی طرف دعوت کے سوا ان کا کوئی مقصد ہی نہیں

وَهُمْ لَا يَتَكَلَّمُونَ فِى سِيَاسَة

اور وہ کسی سیاسی بکھیڑے میں نہیں الجھتے۔

حضرت تو اس کو بھی عصبیت فرماتے کہ کوئی شخص مسجد یا منیٰ عرفات میں اپنے جاننے والے کے لئے تو پَر سکیڑ کر جگہ بنا دے اور اگر کوئی اس کے لئے اجنبی ہو تو پھیل کر بیٹھ جائے تا کہ اُسے اٹھانا نہ پڑے۔

خیر حضرت کا ذِکر بیان کرنے کے لئے تو دفاتر چاہیئے۔ مختصر یہ کہ گذشتہ پوری صدی میں حضرت سے بڑا امّت کا خیر خواہ شاید ہی کوئی پیدا ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حضرت کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس نصیب فرمائے۔ آمین۔

حضرت مولانا سعید احمد خانصاحبؒ کا وِصال

ایک محتاط اندازے کے مطابق حضرت کی عمر تقریباً سو سال کی ہوئی۔
حضرت کا آخری ایام میں یعنی انتقال کے ایک سال پہلے سے یہ معمول تھا کہ ہر روز پورا قرآن شریف پڑھنے کی کوشش فرماتے مگر پھر جتنا ممکن ہوتا تِلاوت فرماتے۔ جب کچھ کمزوری اور نقاہت بڑھی تو حضرتؒ نے قرآن مجید سننا شروع کر دیا، کوئی اچھا قاری تِلاوت کرتا اور حضرت سنتے رہتے۔ یہ معمول اس طرح تھا کہ عشاء کے بعد سننا شروع فرماتے جو رات کے ساڑھے بارہ بجے تک رہتا، یہ معمول تقریباً آخری دنوں تک چلتا رہا۔ اِن دنوں نماز با جماعت کے اہتمام کا یہ حال تھا کہ ساری نمازیں با جماعت ادا فرماتے، یہ نمازیں مسجد نور مدینہ مُنورہ میں ادا فرماتے، مگر عشاء کی نماز کے لئے حرم نبوی ﷺ میں حاضر ہوتے۔ البتہ آخری دن جس دن حضرت کا وِصال ہوا کمزوری کی وجہ سے پانچوں نمازیں اپنے کمرے میں ادا فرمائیں۔ حالانکہ حضرت کا اصرار تو یہی تھا کہ جماعت سے ادا کریں، مگر ڈاکٹروں کی شدید تاکید کی وجہ سے مجبور ہوئے۔

وہ ۲۵ رجب ۱۴۱۹ھ ہفتہ کا دن تھا، اسی دن رات کو بعد نمازِ عشاء سے بے ہوشی طاری ہوگئی، اس کے بعد حضرت نے کلام نہیں فرمایا اور اسی رات یعنی اتوار والی رات تقریباً ۱:۱۵ (سوا) بجے حضرت اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے، اسی دوسرے دن بروز اتوار ۲۶ رجب ۱۴۱۹ھ فجر کی نماز سے

پہلے مسجدِ نور کے مہمان خانہ میں غسل و تکفین سے فارغ ہو کر اذان فجر سے پہلے ہی جنازہ کو سارے احباب مسجدِ نبوی ﷺ میں لے آئے جہاں نمازِ فجر کے بعد اِمام مسجدِ نبوی شیخ عبدالباری الثبیتی نے جنازہ پڑھائی۔

اس طرح ساری دنیا میں اللہ کا نام اور کام لے کر دیوانہ وار پھرنے والے اور اللہ کے دین کے خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے والے ولی اللہ حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ جنت البقیع میں اپنے ہم رکابوں سے جا ملے اور اپنے پیچھے ایک ایسی خلاء چھوڑ گئے جو شاید برسوں میں بھی پُر نہ ہو۔

جاتے جاتے سورج نے تاروں کو یہ سمجھایا
اِک چراغ بہتر ہے لاکھ دیئے جلانے سے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مَودودیؒ

یہ ساٹھ کے عشرہ کی بات ہے جب پاکستان میں ایوب خان برسرِ اِقتدار تھے، چونکہ وہ ایک فوجی ڈِکٹیٹر تھے، اس لئے پاکستان کی ساری جمہوری پارٹیوں نے ان کے خلاف ایک مُتحدہ محاذ قائم کیا تھا۔ ایک فوجی سربراہ ہونے کی حیثیت سے ایوب خان کی پکڑ ملک پر سخت تھی، لہٰذا تنہا ساری پارٹیاں بھی مل کر ایوب خان کو اِقتدار سے محروم نہیں کر سکتی تھیں، اس لئے ان پارٹیوں نے محترمہ فاطمہ جناح جو قاعدِ اعظم محمد علی جناح کی بہن تھیں، کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور ان سے یہ شرط ہوئی تھی کہ فوجی حکومت کو ہٹانے کے بعد وہ ریٹائیر ہو جائیں گیں اور اِقتِدار جمہوری اداروں کے حوالے کر دیں گی۔ خیر یہاں پر یہ ساری بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ الیکشن کا کیا ہوا تھا، البتہ اسی الیکشن کی دھمال میں ہم حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مَودُودیؒ کے قریب آئے، کیوں کہ ہم نوجوان تھے اور سارے ساتھی بھی الیکشن میں حصّہ لے رہے تھے اور تقریباً سارے ہی دوست دین دار ہونے کی وجہ سے جماعتِ اسلامی کی مدد کر رہے تھے، ہم بھی ساتھ ہو لئے۔

حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مَودُودیؒ ان دنوں جیل میں تھے، مگر جب

رِہا ہوئے تو ان کا ایک جلسہ نشتر پارک کراچی میں مُنعقِد ہوا، جس میں پہلی دفعہ حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مَودُودی صاحبؒ کی تقریر سننے کا اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس جلسہ میں مولانا صاحب نے جس دِلیری سے حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی، اسے سن کر میں بہت مُتاثر ہوا، جوانی تھی، جوش تھا، اس لئے ساری جوشیلی باتوں میں بڑا لطف آیا اور بے ساختہ علامہ اقبال کا شعر زبان پر آ گیا

الفاظ و معنی میں نہیں ہے تفاوت لیکن
مُلاّ کی اذان اور، مُجاہد کی اذان اور
(اقبال)

دوران خطاب جب مَودُودی صاحبؒ نے دھاڑ کر کہا کہ:

ایوب خان تمہاری نام نِہاد اسلامی ریاست کو تو ڈوب مرنا چاہئے جس میں زِنا جائز اور نکاح ناجائز ہو۔

واقعی جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، یہ بات مولانا مَودُودی صاحبؒ نے ایک مُقدمہ کے پس منظر میں کہی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ ایوب خان نے اپنے دورِ اِقتِدار میں مسلمانوں کے عائلی قوانین بنائے تھے، جس میں کچھ اور واہیات شقوں کے ساتھ ایک شق یہ بھی تھی کہ اگر کوئی مرد اپنی پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنا چاہتا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی پہلی بیوی

سے تحریری اجازت لے ورنہ وہ دوسرے نکاح کا مجاز نہیں ہوگا۔ اب ہوا یہ تھا کہ ایک صاحب نے اپنی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کر لی تھی، پہلی بیوی نے مُقدمہ دائر کر دیا، جب معاملہ عدالت تک پہنچا تو مرد نے یہ موقف اختیار کیا کہ جو عورت میرے ساتھ رہتی ہے وہ میری دوست ہے، میری بیوی نہیں ہے، عدالت نے مُقدمہ خارِج کر دیا۔ اس پر مولانا مَودُودی صاحبؒ نے فرمایا تھا 'ایسی اسلامی ریاست کو ڈوب مرنا چاہئے جہاں زِنا جائز اور نکاح ناجائز ہو' واقعی وہ ایک شمشیر برہنہ تھے، ایک کھُلی اسلام کی تلوار تھے، کبھی ایسے معاملات میں انھوں نے مداہنت سے کام نہیں کیا۔

بہرحال مولانا مَودُودی صاحبؒ ایک مُجاہد انسان تھے، ان کے پیشِ نظر ایک مِشن تھا اور وہ مِشن اسلامی حقیقی ریاست کا تھا۔ ان کی ساری کاوِشیں جو انھوں نے کیں، چاہے وہ جدوجہد کے راستے سے ہوں، چاہے وہ ان کی تحریرات کے راستے سے ہوں، سب کا محور یہی تھا۔ واقعی انھوں نے نئے انداز سے اسلامی لٹریچر تیار کیا جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں دین کے احیاء کا سبب بنا اور ان کی تحریرات سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک اسلامی ریاست کے احیاء کی زبردست تحریک پیدا ہوگئی اور ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اس امّت کو تنزل سے نہیں بچایا جا سکتا جب تک اِقتدار کی باگ ڈور نیک اور صالحین کے ہاتھوں میں نہیں آجاتی، کیوں کہ مولانا مَودُودی صاحبؒ اس بات کو دل کی گہرائی سے مانتے تھے اور ان کا یہ پختہ یقین تھا کہ دین کو جب تک 'مِن حیث الکُل' نافذ نہیں کیا جائے گا، دنیا اس

عالمگیر مذہب کی برکتیں اس وقت تک نہیں دیکھ سکتی۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ فرماتے کہ ختمِ نبوت کا منشاء پورا نہیں ہو سکتا جب تک دین اِقتدار کے ایوانوں میں نہیں پہنچ جاتا اور وہ بھی ایسے لوگوں کے ہاتھوں جو اسکے اہل بھی ہوں اور ساتھ ساتھ اہلِ تقویٰ بھی ہوں۔ انھوں نے اپنے مندرجہ بالا نظریہ کی زبردست وکالت کی اور اتنا جاندار اِستدلال اختیار فرمایا کہ ان کے مُخالف بھی ان کے اس کام سے مُتاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

دوسری طرف انھوں نے باطِل کے رد میں بھی بڑا نُمایاں کام کیا، ہر باطِل نظریہ کی تردید میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، وہ خود فرماتے ہیں کہ باطِل نظریات کا سد باب صرف اور صرف اسلامی ریاست کے قیام میں مضمر ہے، جس کے ذریعہ آپ نیکی کا حکم کر سکتے ہیں اور برائی کو روک سکتے ہیں۔ اور فرماتے کہ تلقین اور تبلیغ کے ثمرات اسلام کے غلبہ کے بعد جو ظاہر ہونگے ان کا اندازہ آپ لوگوں کو نہیں، یہ کر کے دیکھنے کا کام ہے۔ اور فرماتے کہ فتنہ اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک اس کا سر نہ توڑا جائے۔ ہر باخبر اس بات سے واقف ہے کہ پاکستان میں کتنے فتنوں نے سر اٹھایا، اور پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان میں جو فِتنے تھے، ان کی وجوہات ہی یہ تھیں کہ ریاست صالحین اور مُصلحین کے ہاتھوں میں نہیں تھی، ورنہ وہاں اور آج یہاں یعنی پاکستان میں علماء اور صلحاء کی کوئی کمی نہیں مگر فتنہ ہے کہ وبا کی شکل میں پھیل رہا ہے۔

انھوں نے سب سے بڑے فتنہ قادیانی کا بڑا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اس

کے لئے انھوں نے جیل بھی بھگتی اور پھانسی تک پہنچ گئے مگر کسی بھی دباؤ کے سامنے اپنا سر نہیں جھکایا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ان کو پھانسی کا آرڈر ہوا تو ان سے کہا گیا کہ آپ معافی مانگ لیں، ہم پھانسی کو عمر قید میں تبدیل کردینگے۔ اس مردِ خدا نے جواب دیا کہ 'میں کیا تم سے جنت کے خلاف اپیل کروں' اور فرمایا کہ 'یہ موت جو مجھے قادیانیوں کے خلاف ڈٹ جانے کے صِلہ میں مل رہی ہے جنت کے راستے کی موت ہے، اِس کا مجھے پُختہ یقین ہے'۔

بہرحال اسلامی ملکوں کے دباو پر اور کچھ داخلی مشکلات کی وجہ سے حکومتِ وقت کو ان کی پھانسی کا حکم واپس لینا پڑا۔ ان دنوں جب مولانا مَودُودی صاحبؒ کو پھانسی کا حکم سنا دیا گیا تھا اور پھانسی کے قیدیوں کا ان کو لباس تک پہنا دیا گیا تھا، ان کے جیلر کا بیان اخبار میں شائع ہوا تھا کہ جب ان کے جیلر (JAILER) سے پوچھا گیا کہ پھانسی کے حکم کے بعد مولانا مَودُودی صاحبؒ کی کیا کیفیت تھی؟ تو اس نے بتایا کہ میں نے اپنی زندگی میں اس قدر مضبوط اعصاب کا انسان نہیں دیکھا۔ اس نے بتایا کہ جب ہم نے مولانا مَودُودی صاحبؒ سے پوچھا کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے تو جواب میں مولانا مَودُودی صاحبؒ نے تین چیزوں کی درخواست کی ا۔قرآن مجید ۲۔مِسواک ۳۔وضو اور استنجاء کیلئے پانی۔

پھر قرآن مجید کچھ تلاوت کے بعد لوٹا دیا کہ 'یہاں کوٹھری میں قرآن مجید رکھنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں ہے، اس لئے بے ادبی ہوگی۔ پھر مولانا

مَودُودی صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر مجھے اِزار بند بھی دے دیا جائے تو عنایت ہوگی' اس پر جیلر نے عرض کی کہ پھانسی کے قیدیوں کو اِزار بند نہیں دیئے جاتے، مبادا وہ خود کشی کرلیں ۔جیلر کے جواب پر مولانا مَودُودی صاحبؒ مسکرائے اور کہا' ایسا کون دیوانہ ہوگا کہ جنت میں جاتے جاتے دوزخ میں چلا جائے'۔

یہ تھے حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مَودُودی صاحبؒ جنھوں نے باطِل کے خلاف ''چومُکھی'' لڑائی لڑی، وہ ایک طرف قادیانیوں کے خلاف صف آراء تھے تو دوسری طرف مُنکرین حدیث کا بھی پیچھا کررہے تھے اور ان کو بھی نیچا دکھا کر چھوڑا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن میں احادیث کے خلاف جو زہر مُنکرینِ حدیث نے بھرا تھا، اس کو بڑے خوبصورت انداز سے صاف کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں میرا کافی آنا جانا حضرت مولانا مُفتی ولی حسن صاحب ٹونکیؒ کے یہاں تھا، کیوں کہ حضرت نے میری ڈیوٹی لگائی تھی کہ میں مارکیٹ سے جدید تجارتی مسائل کی تفصیل ان کو مُہیا کروں تاکہ وہ ان پر تحقیق فرمائیں اور اس پر ایک پیپر تیار کریں، اتفاق سے ان یہ دنوں غلام احمد پرویز کے خلاف کفر کا فتویٰ علماء نے متفقہ طور پر دیا تھا جس نے انکار حدیث کا فتنہ برپا کیا تھا۔ جب اس ضمن میں حضرت مُفتی صاحب سے بات ہوئی تو حضرت نے مجھے فرمایا' امان اللہ! چاہے کوئی کچھ ہی کہے مگر ان منکرین احادیث کے خلاف جو لڑائی مولانا مَودُودی صاحبؒ نے لڑی ہے وہ قابلِ تعریف ہے، بلکہ انھوں نے تو باخدا یہاں تک مجھے کہا کہ اگر ابوالاعلیٰ

مودودی ان منکرین حدیث کے خلاف اپنی کتاب ''سنت کی آئنی حیثیت'' نہ لکھتے تو شاید جدید تعلیم یافتہ طبقے کو علماء قائل نہ کر سکتے کہ پرویز کافر ہے۔

سید صاحب کی خوبیاں

اسی طرح انھوں نے داخلی اور خارجی فتنوں کا بھرپور مقابلہ کیا۔ مشرقین (ORIENTALIST) کو بھی انھوں نے بڑے مدلّل جوابات دیۓ اور ان کے اسلام کے خلاف پھیلائے ہوۓ نظریات پر بھرپور تنقید کی، اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو معذرتانہ انداز سے باہر نکالا اور مسلمان نوجوانوں میں حمیّت دین کوٹ کوٹ کر بھردی۔ چونکہ مولانا اسلامی نظامِ تعلیم کے سب سے بڑے داعی تھے اور ان کے ہاتھ میں اِقتدار تھا نہیں، اس لئے انھوں نے دوسرا راستہ اختیار فرمایا، وہ یہ کہ نوجوانوں کی ایک ایسی فوج تیار کی جو ایک طرف جدید تعلیم سے لیس تھی تو دوسری طرف دین کے لئے مر مٹنے کے لئے تیار تھی، ان نوجوانوں کے ذریعہ مولانا مودودی صاحبؒ نے کالج اور یونیورسٹیوں کے ماحول کو اسلامی بنانے کی کوشش فرمائی، ایک طرف یہ دینی کام ہورہے تھے اور امّت کے لئے مر مٹنے کے لئے ایک طبقہ تیار ہورہا تھا تو دوسری طرف قدیم طرز کے علماء میں سے بھی کچھ علماء انکے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے، اگرچہ مولانا مودودی صاحبؒ کا طرزِ تحریر ان کے معیار پر نہیں تھا مگر امّت کی مجموعی بہتری کے خاطر وہ ان کی چند لفظی لغزشوں کو برداشت کررہے تھے۔ وہ وقت ان کے لئے ان کی زندگی کا

بہترین وقت تھا، کیوں کہ اسلامی ریاست کا پاکستان میں خواب دیکھنے والا کوئی بھی مُصلح ان دونوں طبقات سے کبھی بھی مستغنی نہیں ہوسکتا، اسے ان دونوں ہی ہتھیاروں کی ضرورت پڑیگی اور اس کے اندر دونوں خوبیوں کی بھی اشد ضرورت رہے گی، یعنی ایک طرف وہ قدیم اور جدید علوم سے آراستہ بھی ہو تو دوسری طرف وہ انتہائی بلند حوصلہ اور ابوالاعلیٰ والے اعصاب رکھتا ہو۔

سید صاحب کی عظیم غلطی

افسوس صد افسوس! مولانا مَودُودی صاحبؒ اپنی ان خوبیوں کو CASH نہ کرسکے اور وہ باطل سے لڑتے لڑتے گھر سے بھی الجھ گئے۔ جہاں تک میں ان کو سمجھ سکا ہوں، ان کی طبیعت ہی کچھ اس طرح کی تھی کہ جس کو حق سمجھتے، اس کی زبردست حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے اور مدِ مقابل کو زیر کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادیتے، مگر ہر جوش کے لئے ہوش کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ مولانا مَودُودی صاحبؒ دینی کام میں بھی 'حکمتِ عملی' کے زبردست داعی تھے مگر وہ خود حکمت عملی سے کام لے نہ سکے، میرا مقصد یہ ہے کہ انھوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن موضوعات کی چنداں ضرورت تھی ہی نہیں، ویسے ہی ان کے بعض موضوعات وجہ نزاع بنے ہوئے تھے کہ انھوں نے ''خلافت وملوکیت'' کے موضوع کو چھیڑ دیا کہ اسلام میں خلافت کے بعد ملوکیت کیسے آئی۔ یہ موضوع

مسلمانوں کے لئے کوئی نیا موضوع نہیں تھا، سالہا سال سے مُفکرین اس موضوع پر لکھتے رہے تھے اور تقریباً اس موضوع کو سمیٹ دیا گیا تھا، اب اس میں مزید تحقیق کی چنداں ضرورت نہیں تھی، مگر مولانا مَودُودی صاحبؒ کو اللہ معاف رکھے، انھوں نے اس موضوع کو بالکل مختلف انداز سے چھیڑا اور صحابہ کرامؓ میں سے چند صحابہؓ کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، خصوصاً حضرت معاویہؓ کی ذاتِ گرامی پر بڑے رکیق حملے کئے جس کی وجہ سے ان کی کتاب سے صاف طور پر یہ تاثر مل رہا تھا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد صحابہ کرامؓ کا وہ معیار جو مطلوب تھا، اب وہ باقی نہیں رہا تھا جس سے عصمت صحابہؓ پر بہت بڑی چوٹ پڑ رہی تھی، چونکہ ایسی باتیں ایک سُنّی مسلمان کی قلم سے نکلی ہوئیں تھیں، اس لئے شیعہ حضرات کے ہاتھ میں بھی ایک ہتھیار آ گیا جس نے اہلِ سُنت والجماعت کو عظیم نقصان پہنچایا اور خود ان کے اپنے مِشن کو بہت بڑا نقصان پہنچا، وہ اعتدال پسند عُلماء جو اسلامی ریاست کی جدوجہد میں انکا ساتھ دے رہے تھے، وہ بھی ان کے خلاف ہو گئے اور وہ میدان میں تنہا رہ گئے۔ یہی کچھ اہلِ باطل چاہتے تھے کہ ان کو اکیلا کر دیا جائے، وہ دانستہ یا نا دانستہ ان کے جال میں پھنس گئے۔ جب وہ ایسے غیر ضروری موضوع پر قلم اٹھا رہے تھے تو اعتِدال پسند عُلماء نے ان کو کافی سمجھایا کہ آپ اِن موضوعات کو نہ چھیڑیں مگر بُرا ہو خود فریبی کا کہ وہ جسے اصلاح سمجھ رہے تھے وہی سب سے بڑا فساد تھا۔ یہ بات یہاں یاد رہے کہ حق پرست عُلماءِ کرام حضرت مولانا مَودُودی صاحبؒ کو کوئی حق بات کہنے سے نہیں روک

رہے تھے اور نہ ہی ان سے کہہ رہے تھے کہ آپ مداہنت سے کام لیں بلکہ ان کو حق کی طرف لوٹا رہے تھے اور ان سے کہہ رہے تھے کہ حضرت! اگر صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت سے اگر لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا تو پھر دین سے ہی اعتماد اُٹھ جائیگا اور اس 'قحطُ الرِجال' کے زمانے میں جب کہ لوگوں کی دینی حالت بھی کمزور ہے، اکابرینِ امت پر آپ کی زبان میں تنقید سب کچھ لے کر ڈوبے گی۔ اور ان کو یہاں تک متنبہ کیا گیا کہ حضرت آپ جن حالات کی بنیاد پر ان مقدس بزرگوں پر تنقید فرمارہے ہیں، ان کی کوئی مضبوط اساس نہیں ہے اور ایسی بودی اور کمزور شہادتوں کی بنیاد پر صحابہ کرامؓ کو مطعون کیا نہیں جاسکتا۔ ان باتوں کی صرف ان کو نصیحت ہی نہیں کی گئی بلکہ ان کی تنقید کا مُدلّل جواب تک ان کو دیا گیا، اس کا جواب دینے کا سب سے بڑا حق میرے بزرگ دوست حضرت مولانا مُفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی نے ادا کیا جس خیر خواہی اور پیار سے حضرت مُفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ان کو سمجھایا اور ان کو غلطی سے رجوع پر آمادہ کیا، وہ ان ہی کا حصہ ہے، اگر کوئی چاہے تو حضرت مُفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی کتاب ''حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق'' ضرور دیکھے۔

اہلُ اللہ کی ضرورت

آپ کہیں گے جب ہماری اس کتاب کا موضوع ''بڑے اشخاص کی صحبت'' ہے تو پھر بیچ میں ہم یہ تنقید کا موضوع کہاں سے لائے؟ بات آپ

کی صحیح ہے مگر اس موضوع کا تعلق بھی اسی موضوع سے ہے، کیوں کہ جس طرح ہم نے کچھ بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہے، اسی طرح کچھ حضرت مودودی صاحبؒ کی بھی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے، جہاں سب سے زیادہ جو کمی محسوس ہوئی تھی، یہ وہی تو کمی تھی جو کسی اہلِ دل بزرگ سے وابستہ شخص میں نہیں ہوتی۔ جب انسان اکیلا چلتا ہے اور اس کے سر پر کوئی استاد یا اللہ کا کوئی نیک بندہ ایسا نہیں ہوتا جو وقتاً فوقتاً اسے صحیح مشورہ دیتا رہے، تب اکثر ہوتا یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے آپ کو 'عقلِ کُل' سمجھنے لگتا ہے اور بعض اوقات ایسی ایسی ٹھوکریں کھاتا ہے جن کو درست کرنا مُحال نہیں تو ناممکن ضرور ہو جاتا ہے، کیوں کہ جب انسان غلطی کرتا ہے تو مشکل ہی سے اسے اپنی غلطی نظر آتی ہے، یہی کچھ حضرت مودودی صاحبؒ کے ساتھ ہوا۔ واقعی وہ عظیم صلاحیتوں کے مالک تھے اور امّت کو صحیح راستہ پر لے جا سکتے تھے مگر آئے دن کوئی ایسا مسئلہ چھیڑ دیتے جس سے وہ اپنوں ہی سے دور ہوتے چلے گئے۔

یہ بات یہاں یاد رہے کہ ان کو کوئی اصلاحی مضامین سے نہیں روک رہا تھا، ان سے جو کچھ کہا جا رہا تھا وہ یہ تھا کہ حضرت آپ گڑے مُردے نہ اُکھاڑیں اور اسلاف کے بارے میں اپنی قلم کی نوک کو اتنی تیز نہ کریں، اسلاف ہی امّت کا وہ سرمایہ ہے جن کے سہارے یہ امّت کچھ سانس لے رہی ہے۔ آپ اپنے آپ کو یا امّت کو اس بحث سے کیا فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں کہ آئمہ اربعہ ایک دوسرے پر کس زبان میں تنقید کرتے تھے؟ اور یہ کہ

حضرت علیؓ حق پر تھے یا حضرت معاویہؓ؟ اور اللہ تعالیٰ نے کس نبی کی کہاں گرفت فرمائی وغیرہ۔ امت ان ہی بحثوں اور قصوں کی وجہ سے برباد ہوئی تھی۔ آپ کے قلم میں ایک جادو تھا، آپ چاہتے تو ان ساری بحثوں کو بہترین رُخ دے سکتے تھے، مگر بات وہیں آکر رُک جاتی ہے کہ جب ان کو کچھ متنبہ کیا جاتا تو فرماتے 'میں زیادہ سمجھتا ہوں' اور زیادہ سمجھنے کی بیماری کا علاج صرف اور صرف ایک ہی ہے کہ 'ہر بڑے کا بھی کوئی بڑا ہونا چاہئے'۔

میرے شیخ حضرت تو مُفتی محمد شفیع صاحبؒ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے ہر شخص دوسرے کو بڑا سمجھتا تھا، تو ہر شخص بڑا تھا، جب ہر شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگا، اب کوئی بڑا نہیں۔

مجھے آج تک ایک واقعہ یاد ہے۔ ہم کچھ دوست حضرت مولانا فضل الرحمن انصاریؒ صاحب سے ملنے حاضر ہوئے تھے، ان سے مختلف موضوعات پر بات ہورہی تھی، اس میں سید مودودیؒ کا ذِکر خیر بھی آگیا، حضرت نے فرمایا کہ مجھے ایک دفعہ سید مودودیؒ نے کہا کہ 'انصاری صاحب! آپ ہماری جماعت میں آجائیں۔ اس پر میں نے جواب دیا کہ:

> حضرت آپ کام تو بہت لے کر اٹھے ہیں، اس میں آپ کو عوام اور علماء کا قدم قدم پر ساتھ چاہئے مگر آپ آئے دن غیر ضروری مسائل میں الجھ جاتے ہیں اور آپ نے بعض ایسے مُتنازع موضوعات کو چھیڑا ہے کہ شاید ہم اسلامی ریاست حاصل ہونے

کے بعد بھی نہ چھیڑتے۔

میرے کہنے کا مقصد صرف تنقید نہیں ہے بلکہ واقعی میرا دل جل رہا ہے کہ اسلامی ریاست کے دروازے پر دستک دیتے دیتے ہم رہ گئے۔اب میری جماعتِ اسلامی کی آئندہ قیادت کو ایک ہمدردانہ نصیحت ہے کہ وہ دوبارہ وہ غلطی نہ دوہرائیں جوان کے پیش رووں نے کی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ پاکستان کی ہر حکومت ان سے خائف رہتی تھی اور باطل ان سے لرزتا تھا مگر بعد میں مولانا کی تحریروں نے ان کو ایک بڑا ہتھیار فراہم کردیا جو وہ چھاپ چھاپ کر عوام میں پھیلا رہے تھے اور جماعت کی ساری توانائیاں اس کی گلو خلاصی میں صرف ہوتی رہیں، اس طرح مزید تعمیر کا کام بھی رُکا اور پچھلا کام بھی مشکوک ہوگیا۔

سید مَودُودیؒ کا علمی کام

جیسا کہ ہم نے کچھ روشنی سید صاحب کے علمی کام پر ڈالی ہے، مزید یہ کہ سید صاحب کی مُتنازع تحریروں سے ہٹ کر اگر ان کا کام دیکھا جائے تو کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اسلامی لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں احیاءِ دین کے لئے نیا ولولہ پیدا کیا اور اسلام کے لئے مرمٹنے والا ایک طبقہ پیدا کیا جن کی آوازیں ایوانِ اِقتدار میں سنی جانے لگیں۔اسی طرح خواتین جو جدید تعلیم یافتہ نہیں تھیں، ان میں بھی حمیت دین پیدا ہوئی اور کالج اور یونیورسٹی میں خواتین باپردہ جانے میں فخر محسوس کرنے لگیں

جہاں مغرب سے مرعوب ہمارے لیڈروں نے اسلامی روایات کو خیرباد کردیا تھا۔ جو لوگ پاکستان میں یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ یہاں لادینیت بڑے آرام سے لائی جاسکتی ہے وہ ایک دفعہ مایوس ہوگئے، بلکہ سید مودودیؒ ان کو دفاعی پوزیشن میں لے آئے، جہاں کہیں کوئی فتنہ سر اٹھاتا، سید مودودی بھرپور طریقہ سے اس کا تعاقب کرتے، ان کا انقلابی لِٹریچر دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کے لئے غذا کا کام دینے لگا، تقریباً ساری دنیا کی اسلامی تحریکوں نے ان کی تحریرات سے فائدہ اٹھایا، دنیا کی کئی زبانوں میں ان کے لِٹریچر کا ترجمہ ہوا اور کئی ملکوں میں وہاں کی کالج اور یونیورسٹیوں میں ریفرنس کے طور پر ان کی کتابیں پڑھی جانے لگیں۔ ان کی چند انتہائی مفید کتابوں میں مندرجہ ذیل کتابیں سرِ فہرست ہیں۔ 'سنت کی آئینی حیثیت' -'پردہ'-'سود'-'مسئلہ قادیانی'- 'ضبط تولید'-'مسئلہ قومیت'- 'تنقیمات'- 'سیرتِ رسولﷺ'-'رسائل و مسائل' وغیرہ۔ جبکہ اور بھی کافی مسائل پر انھوں نے قلم اٹھایا اور بڑے مفید مضامین سُپردِ قلم کئے۔

سیّد مودودیؒ کی چند مجالس

سیّد صاحب ایک حلیم الطبع اور ظریف انسان تھے، بڑی شفقت سے پیش آتے، ہنستے بولتے اور لطیفے سناتے، بڑی علمی باتیں کرجاتے، ان کی مجلس میں کوئی شخص بھی حجاب محسوس نہ کرتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جہاں حضرت تشریف رکھتے وہ کمرہ کھچا کھچ بھر جاتا تو نئے آنے والے کو خود سُکڑ کر

اپنے پاس بیٹھا لیتے۔ لوگ ان سے ہر مسئلہ پر بات کرتے، حضرت بڑی متانت سے جواب عنایت فرماتے اور کبھی چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار نہ ہوتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی صاحب ایسا علمی سوال کرتے جس میں فتویٰ کی ضرورت ہوتی تو صاف کہہ دیتے کہ میں یہ جواب علمی رنگ میں دے رہا ہوں اور میری تحقیق یہ ہے مگر تمہیں اگر فتویٰ لینا ہے تو وقت کے مفتی سے پوچھ لو کیونکہ مجھے سندِ افتاء حاصل نہیں۔ ایک دفعہ ایک صاحب نے پوچھا کہ حضرت! آپ نے لکھا ہے کہ نائلون کی جُرابوں پر بھی وضوء میں مسح ہوسکتا ہے تو کیا ہم بھی اس مسئلے پر عمل کریں۔ حضرت نے فرمایا:

> اگر تم عمل کروگے تو اپنی ذمہ داری پر کروگے، وہ میری تحقیق ہے، فتویٰ نہیں۔ اگر آپ کو مسح کرنا ہے تو آپ کسی مُفتی سے پوچھ لیں۔

ایک مجلس میں ایک نوجوان نے سوال کیا کہ حضرت! اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ وہ اگر کسی چیز کو وجود میں لانے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہہ دیتا ہے 'ہوجا' تو وہ ہوجاتی ہے یعنی وجود میں آجاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کو زمین اور آسمان کے بنانے میں چھے دن کیوں لگ گئے'؟ سید صاحب مسکرائے اور برجستہ اس نوجوان سے پوچھا کہ بیٹا تمہاری عمر کتنی ہے؟ اس نے کہا '۲۵ سال' حضرت نے کہا:

> کائنات کے بنانے میں تو اللہ تعالیٰ کو صرف چھ (٦) دن لگے اور تم کو جو صرف ساڑھے پانچ فِٹ کے ہو

پچیس (۲۵) سال لگ گئے، یہ بھی کبھی سوچا؟ واقعی وہ نوجوان اور سارا مجمع حیران ہوگیا۔ پھر سید صاحب نے فرمایا" بیٹا اس میں بڑی تفصیل ہے، سرے دست تم اس مسئلہ کو یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ جب "کُن" کا امر فرماتا ہے تو ہر چیز وجود میں ضرور آجاتی ہے، مگر اس کا وجود میں آنا ایک تدریج کے ساتھ ہوتا ہے اور اسی تدریج میں ایک حکمت بھی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جہاں عزیز ہے، وہاں حکیم بھی ہے اور ہر کام اسکا حکمت پر مَبنی ہوتا ہے۔ ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی چیز یک لخت وجود میں آجائے، اور یہ سارے ہی کام حکمت پر ہی مَبنی ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت! قرآن مجید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مکمل ضابطہ حیات ہے تو پھر جو احکامات قرآن مجید میں نہیں ہیں ان پر عمل کا اصرار کیوں؟ حضرت سید صاحب نے فرمایا:

کسی حکم کا قرآن مجید سے متصادم ہونا اور بات ہے، اور قرآن مجید کے موافق یا اس کی تشریح میں ہونا اور بات ہے، اس لئے جو احکامات احادیث سے ثابت ہیں، ان کا بھی وہی حکم ہے جو قرآن مجید کا ہے اور

وہ بھی اسی طرح واجب العمل ہیں جس طرح قرآن مجید کے احکامات۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے جو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

اگر میرا رسول اپنی طرف سے کوئی بات جو میری طرف سے نازل نہ ہوئی ہو، میری طرف منسُوب کردے تو میں اس کی 'رگ' گلو کاٹ دوں۔ (یعنی گردن کی رگ)

پھر بھی غلام احمد قادیانی رات دن یہ دعویٰ کرتا رہا کہ مجھ پر بھی وحی آتی ہے، حالانکہ وہ جھوٹا اور کذّاب تھا، پھر اس کی 'رگ' گلو کیوں نہیں کٹی؟'

سید مَودُودی صاحبؒ نے برجستہ جواب دیا:

آپ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بھیجا ہوا رسول اگر کوئی بات میری طرف منسُوب کرے تو میں ایسا کرونگا۔ جب اللہ تعالیٰ نے مرزا کذّاب کو رسول بنا کر بھیجا ہی نہیں تو پھر 'رگ' گلو کٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور مزید فرمایا:

یہی اس کی دلیل کافی ہے کہ وہ شخص انتہائی جھوٹا اور مکّار تھا محاسبہ اسی کا ہی تو کیا جاتا ہے جسے ذمہ داری

سونپی جاتی ہے۔

اہلِ خبر واقف ہیں کہ پاکستان میں ایوب خان کے دورِ حکومت میں جب الیکشن ہو رہے تھے اور ساری پارٹیاں مل کر ایوب خان کے خلاف الیکشن لڑ رہی تھیں، ایک صاحب نے سوال کیا کہ اتنی پارٹیاں مل کر کیسے حکومت چلائیں گی؟ ایک ایوب خان کیا بُرا ہے؟ صرف یہی تو بات ہے کہ وہ فوجی ہے اور اس کی حکومت جمہوری نہیں ہے، باقی ترقی تو اسی کی حکومت میں ہوئی ہے۔ حضرت نے جواباً فرمایا:

> اگر تمہارے گھر میں جھگڑا ہو اور تمہارا چوکیدار تم کو گھر سے نکال دے اور کہے کہ اب یہ گھر مَیں چلاؤں گا تو کہاں تک صحیح ہوگا؟

پھر فرمایا

> ارے بھائی! چوکیدار کا کام چوکیداری کرنا ہی ہے، آپ اس ملک کو ایک دفعہ جمہوری روایات کے تحت چلنے تو دیں، پھر دیکھیں یہاں پر کیسی ترقی ہوتی ہے۔

مولانا عبدالحق مدنیؒ

مولانا عبدالحق مدنی صاحبؒ حضرت مولانا عبدالغفور مدنی نقشبندیؒ کے فرزند تھے اور حضرت مدنیؒ کے ساتھ ہی مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ ویسے میں نے حضرت مدنیؒ کے تینوں بیٹوں کو دیکھا ہے، جناب عبدالرحمان صاحبؒ، مولانا عبدالحق صاحبؒ اور محمد شریف صاحب۔ مگر حضرت مدنیؒ کے روحانی جانشین صرف مولانا عبدالحق ہی تھے اور انھیں ہی حضرت مدنیؒ نے بیعت و ارشاد کی اجازت دی ہوئی تھی۔ یہ تقریباً ۸۲-۱۹۸۱ء کا واقعہ ہے جب میرا ارادہ ہوا کہ میں مدینہ منورہ میں بھی ایک اپنی تجارتی برانچ کھول لوں، کیونکہ میرے کاروبار کا مرکزی دفتر جدہ میں تو تھا ہی، لیکن ہم لوگ ایام حج میں مکہ مکرمہ میں بھی دکان لگالیا کرتے تھے، اس لئے اس دفعہ مدینہ منورہ کا بھی ارادہ کرلیا۔ لہٰذا وہاں پر ایک ایسے بڑے گودام کی ضرورت تھی جس کے ساتھ رہائش اور آفس کا کام بھی ہوسکے۔ اس غرض سے میں مدینہ منورہ سروے کے لئے گیا، سب سے پہلے مسجد نبویؐ شریف کی زیارت اور دعا سے فراغت کے بعد حضرت عبدالحق مدنیؒ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا، وہ وقت حضرت کے معمولات وغیرہ کا تھا، مراقبہ وغیرہ سے فارغ ہوکر حضرت

نے شفقت سے چائے اور پھل وغیرہ سے خاطر کی اور بڑے پرتپاک طریقہ سے ملے، جس سے میں بہت متأثر ہوا اور ہمّت کر کے حضرت ہی سے اپنی غرض وغایت بیان کی، حضرت نے دعا کی اور فرمایا کہ اگر چاہو تو ہماری ہی اس عمارت میں جو عارضی گودام ہے، کرائے پر لے لو۔ میں سن کر چونک پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے میرا اتنا مشکل کام آسان فرمادیا، میں نے جگہ دیکھنے کے بعد حامی بھرلی، کرایہ وغیرہ طے ہوگیا، حضرت نے چابی دے دی اور ہمارا کام شروع ہوگیا۔ پھر حضرت سے روز ملاقاتیں ہونے لگیں، حضرت اپنی اوپری منزل سے اترتے چڑھتے کچھ دیر ہمارے پاس ٹھہرتے اور دعا بھی کرتے اور نصیحت بھی، بس پھر حضرت سے مراسم بڑھتے گئے۔ اس طرح کچھ دن کاروبار کی دیکھ بھال کے بعد مجھے تو جدّہ واپس آنا تھا، اس لئے میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت میں تو واپس جدّہ جارہا ہوں، البتہ میں وقتاً فوقتاً آتا جاتا رہونگا، مگر میری عدم موجودگی میں میرے دونوں بیٹے یہاں ہونگے، حافظ محمد زبیر اور محمد سلمان۔ حضرت نے فرمایا 'کوئی فکر کی بات نہیں، اب وہ آپ کے بچے نہیں ہمارے بچے ہیں' اور حضرت نے یہاں تک کرم فرمایا کہ ان کو اوپر والی منزل کا ایک کمرہ بھی بغیر کرائے کے دیدیا کہ وہ گودام میں نہ رہیں بلکہ اوپر والے کمرے کو استعمال کریں۔ اس مردِ حق نے نہ صرف کمرہ دیا بلکہ اکثر وبیشتر کھانا بھی کِھلا دیا کرتے تھے۔ میرے لئے یہ ایک نعمتِ غیر متوقعہ تھی کہ میرے لئے اور میرے بچوں کے لئے مدینہ منورہ میں اتنی آسانی میسر آگئی اور مزید میرے بچوں کو ایک جلیل

القدر بزرگ کی صحبت بھی میسر آ گئی۔

میرا چونکہ اسی تجارتی غرض سے مدینہ شریف آنا جانا رہتا تھا، اس لئے حضرت سے ملاقاتیں رہتیں، پھر حضرت نے مجھ پر اتنی کرم نوازی مزید فرمائی کہ اپنے گھر ہی میں جہاں میرے بچے ٹھہرے ہوئے تھے، اِصرار کر کے فرمایا کہ آپ جب بھی مدینہ شریف آئیں' میرے یہاں قیام کرینگے، چاہے آپ اپنا کاروبار ہی کیوں نہ ختم کر دیں۔ خیر بھوکے کو کیا چاہئے؟ مجھے تو وہاں دین و دنیا دونوں مل رہے تھے اس لئے حامی بھرلی۔

حضرت سے رفاقت اور حالات

حضرت سے مراسم ٹھیک ٹھاک بڑھ چکے تھے، خصوصاً ایامِ حج میں دنیا بھر کے لوگ ان کے پاس آتے، کیونکہ ان کے والد ماجد حضرت مولانا عبدالغفور مدنیؒ کا حلقہ ارادت بہت وسیع تھا، اس لئے لوگ ان کے انتقال کے بعد حضرت' لانا عبدالحقؒ کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے، حضرت ان کو ذکر و مراقبہ وغیرہ کرواتے اور اسباق بھی دیتے۔ بعد میں حرم شریف کے ۱۹۷۹ء کے حادثہ کی وجہ سے حضرت نے ایسی تمام مصروفیات ترک کر دی تھیں، کیونکہ حکومت کا رویہ تمام دینی تحریکات کے لئے بدل چکا تھا، ویسے حضرت اپنی عام زندگی میں نہایت ہی ظریف انسان تھے، اس لئے ہم نے بھی پیری مریدی سے ہٹ کر ان سے دوستی کر لی، اس لئے پورے لحاظ و مُروّت کے باوجود ان سے بڑی اچھی دوستی ہوگئی، ایک ساتھ کھانا پینا اور رات کو مجلس لگا

کر زندگی کے ہر موضوع پر گفتگو کرنا، چونکہ ہم تاجر ہیں، اسلئے ہمارے تجارتی تجربات سن کر حضرت بڑے محظوظ ہوتے، کبھی حضرت بھی بڑے خوبصورت لطیفے سناتے اور کبھی ہم بھی انھیں سناتے جس سے بڑے خوش ہوتے، واقعی ان میں بڑی خوبیاں تھیں۔

سب سے عمدہ بات جو ان میں دیکھی، وہ ان کی لوگوں کو کھانا کِھلانے کی صفت تھی، بڑے دل سے لوگوں کو کھانا کھلاتے، امیر غریب، عالم غیر عالم، سب کی خاطر فرماتے، خصوصاً حجاج کرام کا بڑا احترام فرماتے۔ایک دفعہ ایک عالم دین حج کے لئے تشریف لائے تو حضرت کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے، ان صاحب نے کچھ زیادہ ہی اونچی ٹوپی پہنی ہوئی تھی، حضرت نے ان کو نصیحت فرمائی کہ عالم کو ایسے لوازمات سے پرہیز کرنا چاہئے۔ جب وہ کھانے کے بعد رخصت ہوئے، حضرت نے مجھے فرمایا کہ حاجی امان اللہ تو میرے والد حضرت عبدالغفور مدنیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اکثر علماء میں تکبّر کا مرض ہوتا ہے، اس لئے جب بھی تمہارے پاس کوئی آئے تو اس کی خاطر وغیرہ خوب کرنا، مگر ان کو پیار سے ان امراض پر بھی متنبہ کرتے رہنا جو ان میں بعض دفعہ اہل اللہ کی صحبت سے دور رہنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

ایک عجیب واقعہ

حضرت کی ایک عادت تھی کہ جب بھی مدینہ شریف کی گلیوں سے

گزرتے، ہاتھ میں ایک پلاسٹک کی تھیلی رکھتے اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں جو گری پڑی روٹی ملتی، اٹھا کر اس تھیلی میں بھر لیتے۔ میں نے ایک دفعہ حضرت سے عرض کیا حضرت! آپ کے ہاتھ میں عصاء، سر پر عمامہ اور وضع قطع صوفیوں اور عالموں والی، پھر اس طرح روٹیاں چنتے کچھ بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ حضرت نے ایک آہ بھری اور فرمایا حاجی صاحب! آپ کو تو پتہ ہے کہ میں یہ روٹیاں اپنی بکری کو کھلا دیتا ہوں، مگر ان روٹیوں کو اٹھانے کا مقصد کچھ اور ہے۔ میں نے تعجب سے پوچھا حضرت وہ کیا؟ فرمایا: تم دیکھتے ہو کہ یہاں پر رزق کی کس قدر نا قدری ہوتی ہے، میں نے کہا کہ یہ تو حقیقت ہے، لوگ آدھا کھاتے ہیں اور آدھا پھینکتے ہیں، اس پر حضرت نے فرمایا:

> جب اور جہاں پر بھی نعمت کی ناقدری ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس نعمت کو سلب کر لیتے ہیں، یہ یہاں بھی ہوسکتا ہے، لہٰذا مجھے بڑا ڈر لگتا ہے، کہیں اہل مدینہ کی پکڑ نہ ہو جائے، اس لئے جب میں روٹیوں کے ٹکڑے اٹھاتا ہوں تو اس وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ یا الٰہی! اگرچہ یہ لوگ ناقدری کرتے ہیں اور یہ نادان بھی ہیں مگر میں نے حتی الامکان قدر کرنے کی کوشش کی ہے تو ان کو معاف کر دینا۔

میں حضرت کی یہ بات سن کر حیران اور ششدر رہ گیا کہ یا اللہ! یہ تیرے نیک بندے تیری مخلوق پر کتنے مہربان ہیں کہ اپنی انا فنا کر دیتے ہیں اور

امّت کی بقا کی فکر کرتے ہیں۔

دوسروں کی رعایت

حضرت سے میرا معاہدہ تھا کہ ان کو اگر کوئی شخص دعوت دیگا تو میں اگر مدینہ شریف میں ہوا تو وہ مجھے ضرور ساتھ لے جائیں گے اور اگر مجھے کسی نے دعوت دی تو وہ میرے ساتھ بھی آئیں گے۔ ایک دفعہ ایک بنگالی تاجر نے جو مدینہ منورہ میں تجارت کرتے تھے، مجھے دعوت دی، حضرت بھی حسبِ وعدہ میرے ساتھ ہولئے، جب وہاں دسترخوان چنا گیا تو میں نے دیکھا کہ اس پر جو روسٹ مرغیاں چنی گئی تھیں وہ غیر ملکی تھیں، لہٰذا مجھے تشویش ہوئی کہ حضرت کیسے کھائینگے، اس لئے میں حضرت کو دیکھ رہا تھا کہ کیا کروں؟ مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ حضرت اس مرغی کو کھانے لگے اور میں بھی ان کے ساتھ شریک ہوگیا۔ بعد میں جب میں نے حضرت سے پوچھا کہ حضرت! آپ تو ان غیر ملکی مرغیوں سے اجتناب فرماتے ہیں پھر کیسے نوش فرمایا؟' حضرت نے فرمایا کہ دیکھو حاجی صاحب! وہ بیچارہ ہمارے لئے اس قدر اہتمام کرچکا تھا، اگر ہم عذر کرتے تو وہ پریشان ہوجاتا اور اس کی بڑی سُبکی ہوتی، اس لئے ہم نے سوچا کہ آج تقویٰ چھوڑکر فتوے پر عمل کرلیتے ہیں، کیونکہ بعض علماء تو اسے جائز ہی رکھتے ہیں، اس لئے ایک مسلمان کو پریشانی سے بچانے کی خاطر میں نے کھالیا۔ واقعی وہ لوگ کتنے حکیم تھے۔

حضرت مولانا عبدالحق صاحب کے پاس کوئی حاجت مند آتا، جو

پاس ہوتا ضرور عطا فرماتے ورنہ کسی واقف کار سے کہہ کر اس کی مدد کروادیتے۔

ایک خواب

ایک دفعہ فرمایا:

حاجی امان اللہ! میں مواضع شریف میں مراقب تھا کہ دفعتاً آپ ﷺ کی زیارت سے مُشرف ہوا، آپؐ نے فرمایا عبدالحق! دنیا کو کیا کرو گے؟ حضرت نے فرمایا "بس اس دن سے دنیا کی بے رغبتی دل میں جم گئی ہے، اب دل ہی نہیں چاہتا کہ مال میرے پاس رہے۔

اس کے بعد واقعی میں نے دیکھا کہ حضرت کچھ زیادہ ہی سخاوت کی طرف مائل ہوگئے تھے۔ ان کا ایک پلاٹ جبل احمد کے دامن میں تھا، اسے بھی فروخت کردیا، کچھ وارثوں میں تقسیم کردیا اور باقی اللہ کی راہ میں دے دیا۔ ان کا اپنا مکان جو مدینہ منورہ کے محلہ باب المجیدی میں تھا، حکومت نے توسیع کے لئے لے لیا تھا، اس کی بھی بڑی قیمت ان کو ملی تھی، اس میں سے بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں کافی خرچ کیا اور باقی ورثہ میں تقسیم فرمادیا اور کچھ رقم سے ان کے بیٹے احمد نے باب العوالی میں مکان بنالیا جو ابھی تک وہیں سکونت پزیر ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے علاوہ حضرت بڑے ظریف بھی تھے، بعض دفعہ بڑے ترنم سے دوستوں کی محفل میں اشعار سناتے اور ہنستے بولتے اور اپنی زندگی کے تجربات سناتے، جس میں ہنسی مذاق کے ساتھ بڑی کام کی باتیں بھی مل جاتیں۔ ایک دفعہ فرمایا کہ میرے والد کے ایک مرید تھے جو والد صاحب کے مراقبہ کروانے کے دوران بڑے وجد میں آجاتے اور خوب اللہ اللہ کی صدائیں بلند کرتے اور لوٹ پوٹ ہوجاتے، لوگ ان کے قریب بھی بیٹھنے سے ڈرتے کہ کہیں ایک آدھ ہاتھ ان کو نہ لگ جائے۔ حضرت نے ہنستے ہوئے فرمایا کہ مجھے اس پر شک ہوتا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی کررہا ہے، کیونکہ لوگ اس کو اللہ والا سمجھ کر پیسے بھی دیتے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے اس سے ایک بار کہا کہ دیکھو میں سفر پر جانا چاہتا ہوں اور تم میرے ساتھ چلو گے، مگر شرط یہ ہے کہ وہاں جب میں مراقبہ کراوں تو تم کو اسی طرح وجد کی کیفیت طاری کرنی ہے اور پھر وہاں جو تمہیں پیسے ملیں گے وہ ہم دونوں تقسیم کرلیں گے۔ وہ فوراً راضی ہوگئے۔ اس پر حضرت نے اس کو سختی سے ڈانٹ دیا کہ:

خبردار آئندہ کبھی والد صاحب کی مجلس میں اس طرح
وجدانی کیفیت طاری کی تو تمہاری خیر نہیں ہے۔

ایک دفعہ حضرت سے میں نے پوچھا 'حضرت! یہ بات جو اہل تصوف میں مشہور ہے کہ پیر جب اپنے کسی مرید کو خلافت دیتا ہے تو وہ کسی غیبی اشارہ کی بنیاد پر دیتا ہے۔ اس میں کتنی صداقت ہے؟ حضرت نے فرمایا: ایسا ہر کسی

کے معاملے میں نہیں ہوتا، کبھی پیر کسی مصلحت کی خاطر بھی کسی کو خلافت دے دیتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ کے والد حضرت مدنیؒ کے بارے میں کراچی میں مشہور ہے کہ جب آپ کے والد ماجد مواضع شریف میں سلام کے لئے حاضر ہوتے تھے تو اپنی سر کی آنکھوں سے آپ ﷺ کی زیارت کرتے تھے؟ اس بات کے جواب میں حضرت نے فرمایا:

پیر نہ پرند مرید پہ پرند

یہ ایک فارسی کا مقولہ ہے جس کا مطلب ہے کہ پیر نہیں اڑتا، اسے مرید اڑاتے ہیں۔ یعنی ہم سے کبھی ایسی بات ہمارے والد نے نہیں فرمائی، اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو ہمیں ضرور پتہ ہوتی۔

ایک مرتبہ ان کے والدؒ کے ایک مرید نے ہندوستان سے ان کو خط لکھا کہ حضرت! میں ایک خانقاہ قائم کرنا چاہتا ہوں اور دعا و مشورہ کے لئے درخواست کی۔ حضرت نے ان کو جواب لکھا کہ اپنے دل کو خانقاہ بناو۔ پھر مجھے فرمایا:

لوگ قلب سلیم کی فکر نہیں کرتے اور خانقاہیں سجاتے ہیں۔

اور مزید فرمایا کہ اگر میں ابھی پاکستان کا سفر کروں، مجھے امید ہے لوگ ہزاروں کی تعداد میں ہوائی اڈے پر آجائینگے مگر اس شہرت کو میں کیا کرونگا'۔

کسرِ نفسی

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ پاکستان کے صوبہ سرحد سے ایک بزرگ حج کے لئے تشریف لائے، جن کی عمر تقریباً ایک سو دس سال تھی اور وہ بھی نقشبندی سلسلہ سے تھے اور مولانا عبدالمعبود کے نام سے مشہور تھے۔ جب حضرت کو پتہ چلا تو حضرت نے مجھے فرمایا حاجی صاحب! چلیں آج ہم آپ کو ایک بزرگ کی زیارت کرواتے ہیں، میں بھی ساتھ ہولیا، جب وہاں حاضر ہوئے تو ان بزرگ نے حضرت کا بڑا اکرام کیا، کیوں کہ ان کا تعلق ان کے والد حضرت مدنیؒ سے رہا تھا۔ مگر حضرت عبدالحقؒ ان کے سامنے دو زانوں ہو کر بیٹھ گئے اور بڑی عاجزی سے عرض کیا کہ حضرت مجھے بیعت کرلیں، مگر مولانا عبدالمعبود صاحبؒ تیار نہیں ہوئے۔ بعد میں میں نے حضرت سے پوچھا کہ حضرت! آپ خود صاحبِ نسبت ہیں، لوگ آپ کے مرید بھی ہیں پھر آپ ان سے کیوں بیعت ہونا چاہتے تھے؟' حضرت نے فرمایا حاجی صاحب! اسی کا نام تصوف ہے اور فرمایا کہ انسان جب کسی کو اپنا بڑا بنالیتا ہے تو شیطان کے اس وار سے بچ جاتا ہے جو شیطان ہر چھوٹے کے دل پر کرتا ہے اور اسے یہ سمجھاتا ہے کہ تو ہی بڑا ہے اور یہی بڑائی اسے لے ڈوبتی ہے۔

الغرض حضرت مولانا عبدالحقؒ کی صحبت میں ہم نے بہت کچھ پایا۔ بعد میں چونکہ مدینہ منورہ کے کاروبار کو ہم نے بند کردیا، اس لئے ہم زیارت مدینہ منورہ کے لئے حاضر ہوتے تو حضرت کے پاس ہی قیام کرتے، حضرت

بڑی خاطر کرتے، خوب کھانا کھلاتے، ان کا دسترخوان ہمیشہ وسیع ہوتا تھا۔ قومیت کے لحاظ سے وہ پٹھان تھے اور پٹھانوں کا دسترخوان ویسے ہی وسیع ہوتا ہے، مگر چونکہ حضرت عرب میں رہتے تھے اور عرب بھی کھانا کھلانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، اس طرح حضرت میں دونوں شانیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ کبھی حضرت فرماتے کہ میں ان لوگوں کے یہاں کھانا کھانا پسند نہیں کرتا جو اپنے مہمانوں کے نوالے گنتے ہیں، یعنی جب کوئی مہمان کھانا کھالے تو اس پر باتیں بناتے ہیں کہ اس نے اتنا کھایا اور ایسا کھایا۔ دو تین مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ حضرت جدہ تشریف لائے تو ہمارے یہاں قیام فرمایا۔

حقیقت تصوف

یہ موضوع بڑا دقیق اور بڑی معرفت چاہتا ہے جس کے لئے ہم کوئی موزوں شخص نہیں ہیں، اس لئے ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ تصوف کا نچوڑ ایک ایسے بزرگ کے اقوال سے تلاش کریں جو اس راستہ کے ایک مُستند امام کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے اقوال کو اہلِ سنّت والجماعت میں سَند کا درجہ حاصل ہے،۔ خصوصاً دیوبندی حضرات کے نزدیک وہ ایک مُجددِ تصوف مانے جاتے ہیں، وہ ہستی ہے حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کی۔ چونکہ ہماری اس کتاب کا موضوع ہی ''اہل اللہ'' کی صحبت ہے، اس لئے یہ ضروری ٹھہرا کہ ہم اس بات کا بھی خلاصہ کریں کہ دراصل بیعت کا مقصد کیا ہے اور اہل اللہ سے وہ کون سے فوائد ہیں جو ان کی صحبت میں مُرید کو حاصل ہو سکتے ہیں یا یہ کہ مُرید کو حاصل کرنے چاہئے اور وہ کون سے نظریات ہیں جو پیری مُریدی میں رائج ہو گئے ہیں۔ اسلئے سب سے پہلے تو یہ ضروری ٹھہرا کہ ہم یہ دیکھیں کہ ہم جس شیخ سے بیعت کرنے جارہے ہیں وہ واقعی اپنے اندر وہ صِفات بھی رکھتے ہیں جو ایک مُصلح کے لئے ضروری ہیں۔ حضرت تھانویؒ اپنے ایک سلسلہ گفتگو میں فرماتے ہیں کہ چونکہ وہ

لوگوں کی اصلاح کی خاطر ان کو ڈانٹ ڈپٹ کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں، اس لئے یہ فکر ان کو رہتی تھی کہ اس مسلک میں ان کا کوئی ہمنوا بھی ہے کہ نہیں۔ اس پر ان کے سامنے شیخ ابنِ عربی کا رسالہ ''آداب شیخ والمُرید'' آیا جس میں حضرت شیخ ابن عربی صِفاتِ شیخ یعنی پیر کی کچھ صِفات بیان فرماتے ہیں جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل سُطور میں پیش کیا جاتا ہے۔

صِفاتِ شیخ

فرماتے ہیں کہ:

شیخ وہ ہے جس میں انبیاء کا سا دین ہو، اطباء کی سی تدبیر ہو، بادشاہوں جیسی سیاست ہو، گویا ایسی حالت ہو کہ مُریدین سے دنیاوی غرض نہ رکھتا ہو۔ ورنہ ایسا شخص تعلیم، روک ٹوک، معاقبہ، محاسبہ، مواخذہ، مطالبہ اور دارو گیر نہیں کرسکتا۔ اور اطباء جیسی تدبیر کے معنی یہ ہیں کہ جیسے طبیب جسمانی امراض کی تشخیص اور ہر مرض اور ہر مریض کیلئے جُدا تدبیر کرتا ہے، اسی طرح شیخ کو باطنی امراض کی تشخیص اور ہر باطنی مرض کے لئے جُدا تدبیر کرنا چاہئے۔ اور بادشاہوں جیسی سیاست کے معنی یہ ہیں کہ وہ مُریدوں کی غلطیوں پر ڈانٹ ڈپٹ، روک ٹوک،

محاسبہ، معاقبہ، مواخذہ اور دارو گیر کرتا ہو۔

یہ سب شیخ کے فرائض میں سے ہیں، اگر شیخ ایسا نہیں کرتا تو وہ شیخ نہیں بلکہ خائن ہے۔

پھر حضرت تھانویؒ مزید فرماتے ہیں کہ:

اصلاح ہوتی ہی اس طرح ہے، مگر چونکہ مدتوں سے یہ انداز مواخذہ متروک ہو چکا ہے اور حقیقت لوگوں سے نا آشنا ہو چکی ہے، اس لئے یہ انداز لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آرہا۔ مگر اسلاف کے یہاں طریق جدا تھا، ان کے یہاں بات بات پر روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ تھی اور محاسبہ ہوتا تھا، ان کا مقصود اصلاح کرنا تھا اور ان کے پاس آنے والوں کا مقصود اصلاح کرانا ہوتا تھا۔ اب آجکل کے مُرید تو اس نیت سے آتے ہیں کہ پیر کے یہاں لنگر جاری ہوگا، روٹیاں کھانے اور کپڑے پہننے کو ملیں گے اور شیخ ہاتھ میں تسبیح لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا ہوگا، جائینگے اور مُرید ہو جائینگے، وہ اپنے سینے میں سے کچھ دے دیگا، گویا کہ نہ شیخ کو مُرید کی اصلاح کی فکر، نہ مُرید کے دل میں اصلاح کی نیت۔

(انوظ ۱۴۵)

پھر مزید آگے فرماتے ہیں کہ:

باب تربیت بالکل بند ہوگیا ہے، مشائخ تک کو اس طرف توجہ نہیں، چند چیزوں کا نام درویشی اور بزرگی رکھ لیا ہے، نہ اعمال کا اہتمام نہ افعال کی خبر، نہ اقوال کی حفاظت، جو جی میں آیا کرلیا، جو منہ میں آیا بک دیا۔ مجنونانہ باتوں کا نام درویشی رکھ لیا ہے باقی بابِ تربیت بڑا ہی نازک فن ہے۔

حضرت تھانویؒ ایک اور موقع پر مزید فرماتے ہیں کہ:

لوگوں کے ذہنوں میں بزرگی کی ایک خاص وضع بھی جاہل صوفیوں کی غلط کاریوں کی وجہ سے جم گئی ہے۔ وہ یہ کہ پیر صاحب ضرور عمامہ باندھے ہوئے ہوں، چوغہ پہنے ہوئے ہوں، تسبیح ہاتھ میں ہو، ناک سے رینٹ بہتی ہو، منہ سے رال جاری ہو اور مکھیاں بھنکتی ہوں، کپڑے بھی بدبودار ہوں اور آنکھیں بند کرکے گردن جھکائے گردوپیش سے بے خبر بیٹھا ہو اور کبھی کبھی گردن اٹھا کر کچھ بول دیا کرے، چاہے بات کچھ پتہ کی ہو یا نہ ہو۔ یہ ہے تصور لوگوں کے ذہن میں اب بزرگی کا۔

فائدہ

گویا حضرت بتانا چاہتے ہیں کہ لوگ کسی سمجھدار اور صاف ستھرے انسان کو پیر ماننے کے لئے اب تیار نہیں، اسی لئے جاہل پیروں کی دکانیں چمک رہی ہیں۔

اسی سلسلہ میں حضرت مزید فرماتے ہیں کہ:

> میں تو یہاں تک بڑھ کر عرض کرتا ہوں کہ چونکہ اصلاح کا فن بڑا نازک ہے، اس میں بڑے ماہر فن کی ضرورت ہے، اس لئے میں کہا کرتا ہوں شیخ (مُصلح) کا ولی ہونا، بزرگ ہونا، قطب ہونا اور غوث ہونا ضروری نہیں، البتہ ماہر فن ہونا ضروری ہے، بغیر اسکے وہ اصلاح وتربیت نہیں کرسکتا۔

پھر فرماتے ہیں کہ:

> مصلح کا عابد وزاہد ہونا بھی ضروری نہیں، جس طرح طبیبِ جسمانی کہ وہ خود کیسا ہی بد پرہیز ہو، لیکن اگر ماہر ہے تو مریض کا علاج کرلیگا۔ ہاں اگر کوئی ماہر فن بھی ہو اور مُتقی پرہیز گار بھی ہو تو اس میں برکت ضرور زیادہ ہوگی۔ آجکل مشائخ کے یہاں اور طبیب کے یہاں بھی اسباب کا علاج نہیں ہوتا یہ بھی

عدم مہارت کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب
کے اندر انسانیت پیدا نہیں ہوتی، چاہے وہ سب کچھ
ہوجائے۔

(ملفوظ ۱۲۹)

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں کہ:

اصلاح کرنے والوں کو چاہئے کہ پہلے اپنے یہاں آنے والوں سے تعلق پیدا کیا جائے۔ پھر اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ میرے پاس آنے والوں میں اگر کوئی داڑھی مُنڈا ہی آئے اور بے عمل ہی آئے، میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ پہلے اس سے تعلق پیدا ہوجائے، پھر اس کو عمل کی توفیق فوراً ہوجاتی ہے۔

(ملفوظ ۳۸۵)

بیعت کی حقیقت

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ:

عام لوگوں نے بیعت کو اسقدر مقصود بالذات بنا رکھا ہے کہ مثل فرض و واجب کے سمجھتے ہیں مگر باوجود اسکے علماء اہل حق جسطرح دوسری بدعتوں کو منع

کرتے اور ان کی اصلاح کرتے ہیں، اس طرح اس کی طرف قطعاً توجہ نہیں کرتے کہ اس طالب کا کیا عقیدہ ہے اور یہ بیعت کو کیا سمجھتا ہے، جہاں کوئی آیا جھٹ بیعت کرلیا، کیا یہ بدعت نہیں کہ غیر واجب کو واجب سمجھا جاتا ہے اور کیا یہ بدعت کی تعریف میں داخل نہیں، اس معاملہ میں تو خصوصی طور پر ڈھیلا پن ہورہا ہے۔

اور ایک موقع پر مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

بیعت کا مطلب اصلاح کے سوا کچھ نہیں، دکاندار پیروں نے تصوف کے فن سے عدم واقفیت کی بنا پر لوگوں کو وظیفے بتلا بتلا کر حقیقت کو مخفی کردیا ہے، کیا اصلاح وتربیت کہیں وظائف سے ہوا کرتی ہے، یہ اصلاح کا کام تو طبیب اور مریض کا سا معاملہ ہے، اگر طبیب کسی مریض کو بجائے نسخے اور تدبیر کے وظیفہ بتلادے تو اس سے علاج کا کیا تعلق۔ اسی طرح یہاں پر سمجھ لیا جائے۔

(ملفوظ ۲۲۷)

حضرت تھانویؒ مزید اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

میرے پاس آنے والا محروم نہیں جاتا، کچھ سیکھ کر ہی

جاتا ہے، کیوں کہ میں ان کے کان حقیقت شناسی کے لئے کھول دیتا ہوں، میں جو کچھ سکھاتا ہوں وہ یہ ہے کہ دوسروں کو اذیت مت پہنچاو، جو خلاصہ ہے تقویٰ، طہارت اور مجاہدہ کا۔

اور مزید فرمایا کہ:

اگر اللہ کے حقوق میں کمی ہو جائے، وہ تو بڑے کریم ہیں، رحیم ہیں، بخش دینگے مگر ان کے بندوں کو مت ستاو، یہ بات بڑی سخت ہے۔

(ملفوظ ۲۹۹)

ایک اور مقام پر حضرت بیعت کا مقصد بیان فرماتے ہیں کہ:

انسان بننا فرض ہے، بزرگ بننا فرض نہیں، کیونکہ انسان نہ بننے سے دوسروں کو تکلیف ہوگی۔ اس لئے میں انسان بنانے کی کوشش کرتا ہوں، بزرگ نہیں بناتا۔ چونکہ جاہل پیروں نے لوگوں کو بگاڑ دیا ہے، اس لئے اب کسی کی روک ٹوک کی جائے تو لوگوں کو وحشت ہوتی ہے۔

(ملفوظ ۳۴۷)

حضرت مزید فرماتے ہیں کہ:

ہمارے پاس صرف دو چیزوں کی تعلیم ہے، اگر کسی کو

پسند ہو، یہاں آئے ورنہ کہیں اور جائے۔اور وہ دو چیزیں یہ ہیں کہ ایک تو گناہ سے بچو اور دوسرا یہ کہ کسی کو بھی تکلیف نہ پہنچاو، اور وہ تکلیف چاہے کسی قسم کی ہو، مالی ہو، جاہی ہو، جانی ہو۔ یہی میرے یہاں سب سے بڑی بزرگی ہے اور یہی درویشی ہے۔

(ملفوظ ۳۴۹)

ایک اور موقع پر فرمایا کہ:

اصلاح صرف اور صرف تعلیم وتلقین سے ہی ہوسکتی ہے۔فرمایا ایک صاحب نے اپنے لڑکے کے بارے میں بہت غصہ والا ہونے کی شکایت کرکے تعویذ طلب کیا، حضرت نے فرمایا کہ اس کا کیا تعویذ ہوسکتا ہے، اسکو تو کسی حلیم الطبع شخص کے پاس بیٹھنے کی ضرورت ہے، اسی تدبیر سے تو امید بھی ہے کہ کمی واقع ہوجائے۔

فائدہ

گویا حضرت فرمارہے ہیں کہ جو کام تعلیم وتلقین سے ہی ہوسکتا ہے، اس کے لئے تعویذ مانگنا گویا تصوف سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

اعمال مطلوب ہیں احوال نہیں

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ:

میں تو کہا کرتا ہوں کہ اعمال بڑی چیز ہیں، احوال میں کیا رکھا ہے۔ اعمال میں جو کیفیات ہیں، وہ محسوس نہیں ہوتیں اور یہ روحانی کیفیات ہوتی ہیں جو اعمال سے پیدا ہوتی ہیں، اور احوال اکثر نفسانی ہوتے ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ اعمال میں جو کیفیات ہوتی ہیں ، ان میں سکون ہوتا ہے اور احوالِ نفسانی میں ایک قسم کا زور شور ہوتا ہے، جس کی وجہ سے یہ محسوس ہوتے ہیں اور وہ محسوس نہیں ہوتے۔لیکن اصل چیز اعمال ہی ہیں، مگر چونکہ ان کے ثمرات باطِنی لطیف ہوتے ہیں، اور محسوس نہیں ہوتے ہیں اس لئے مُرید (سالک) یہ سمجھتا ہے کہ مجھکو کچھ حاصل نہیں ہوا۔

اسی باب میں حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ:

اگر تمام عمر کے مجاہدات و ریاضت کے بعد کوئی یہ سمجھے کہ مجھ کو کچھ نہیں حاصل ہوا، تو اسکو سب کچھ حاصل ہوگیا۔ بشرطیکہ اعمال میں خلل نہ پڑا ہو۔

کیونکہ اس حالت میں اسکی کیفیات روحانی ہیں جو حقیقی کمالات ہیں، جو فنا کی علامت ہے اور اس راستہ کی منتٰہی ہے۔

پھر حضرت فرماتے ہیں کہ:

ایک صاحب نے ان کو خط لکھا کہ اتنا زمانہ مجھے ذِکر وشغل کرتے ہوئے گزر گیا مگر مجھے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ آپ نے ان کو جواب لکھا کہ یہ تمہارے لئے یومِ عید ہے جس میں تمہیں یہ خیال پیدا ہوا، اور وہ یومِ ماتم ہوگا جس روز تمہیں یہ خیال پیدا ہوگا کہ تم کو کچھ حاصل ہوگیا ہے۔

(ملفوظ ۲۸۵)

توجہ کی حقیقت

''توجہ'' یہ بھی تصوف کی ایک معروف اصلاح ہے، ہوتا یہ ہے کہ بعض بزرگوں نے اپنی قلبی قوتِ اِرادی سے اپنے مُریدوں پر توجہ ڈالی اور اس سے مُریدوں کے اندر ایک طرح کی ایسی تحریک پیدا ہوئی جس سے وہ حق کی طرف مائل ہوگئے۔

اس طرح کی 'توجہ' کے بارے میں حضرت تھانویؒ وضاحت فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

میں کہتا ہوں کہ توجہ مُتعارفہ سے قلب کی صفائی نہیں ہوسکتی، اگرچہ بعض بزرگوں نے اس سے کام لیا ہے مگر وہ ایک عارضی چیز ہے جو اس سے حاصل ہوتی ہے مگر اس سے اصلاح نہیں ہوسکتی جو 'بیعت' سے مقصود ہے، اور نہ ہی اس سے کسی مقام کا رسوخ ہوسکتا ہے۔ رسوخ وہی ہے جو اعمال کے ذریعہ سے ہو اور 'توجہ' مسنون تدبیر تک نہیں، ہاں اسے مباح کہہ سکتے ہیں، مسنونیت کا درجہ تعلیم ہی کو حاصل ہے۔ حضراتِ انبیاء علیہ السلام کا اصل کام تعلیم ہی تھا، اگر توجہ مروجہ یا مُتعارفہ اس کا ذریعہ ہوتا تو حضور ﷺ سے زیادہ قوی اور مؤثر توجہ کس کی ہوسکتی تھی، کوئی کافر بھی کافر نہیں رہ سکتا تھا، سب باایمان ہو جاتے۔

'توجہ' سے مطلوب صرف یہی ہے کہ شیخ طالب کے حالات کی نگرانی اور ان حالات کے تقاضے کے مطابق تعلیم کرتا رہے، سو ایسی توجہ بزرگوں کو دائمی طور پر رہتی ہے۔ مثلاً محاسبہ، دارو گیری، مواخذہ، روک ٹوک، تعلیم و تلقین۔ بس یہی سب صحیح 'توجہ' ہے، باقی 'توجہ' مروجہ تو ایک وقتی چیز ہے جس سے استعداد کو ایک گونہ حرکت ہوجاتی ہے پھر کچھ بھی نہیں رہتا، یہ تجربہ کی باتیں ہیں، اور اعمال سے جو رسوخ پیدا ہوتا ہے وہ دائمی ہوتا ہے۔

برکت اور تصرف

حضرت ایک سلسلہ گفتگو میں فرماتے ہیں کہ لوگ بزرگوں کے پاس برکت حاصل کرنے کی نیت سے آتے ہیں اور اس کے لئے گھربار چھوڑتے ہیں اور سفر کی تکالیف برداشت کرتے ہیں، میں کہتا ہوں اگر ایسی ہی برکت حاصل کرنی ہے تو گھر بیٹھے قرآن مجید ہی کی زیارت کر کے برکت حاصل کر لی جائے، قرآن مجید سب سے زیادہ برکت کی چیز ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ میں کیا کہوں؟ لوگوں کا فہمِ دین ہی خراب ہوگیا ہے، اگر اس طرح برکت (اصلاح) کے لئے کافی ہوتی تو جناب رسول اللہ ﷺ میں بے شک وہ برکت تھی کہ ابو طالب تو کیا وہ تو تھے ہی عاشق، وہاں ابو جہل اور ابولہب بھی مسلمان ہو جاتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مراد برکت سے یہ برکت کافی نہیں جسے لوگ آجکل برکت سمجھتے ہیں، بلکہ اس برکت سے 'تعلیم' مراد ہے کہ اس پر عمل کرنے سے جو اعمال و انوار و آثار قلب میں پیدا ہوتے ہیں، وہ حقیقی برکت ہے۔ یہاں سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ لوگ آجکل جس توجہ و تصرف کے دلدادہ ہیں اور ان چیزوں کو کمال سمجھتے ہیں، یہ کوئی کمال کی چیز نہیں ورنہ حضور ﷺ سے بڑھ کر کس کی توجہ اور تصرف کارگر ہوسکتا تھا، اگر اس سے کام لیا جاتا تو آپؐ کی ایک نظر میں عالَم کا عالَم زیر و زبر ہو جاتا اور دنیا میں ایک بھی کافر نظر نہیں آتا، سب کے سب مسلمان اور ایمان والے ہو جاتے، مگر آپ ﷺ کوئی کام اِذن خداوندی کے بغیر نہیں کرتے

تھے، جس جگہ جس قوت کے استعمال کا حکم دیا، وہاں حضور ﷺ نے اسی قوت سے کام لیا، اسی سے تدابیر ماموربہا (مناسب وقت پر مناسب تدبیر) کا درجہ معلوم ہوتا ہے، اصل طریق تدابیر ہیں، اس کا استعمال بھی تربیت ہے۔

(ملفوظ ۳۷۸)

اصلاح کے لئے اَوراد و وظائف

حضرت فرماتے ہیں کہ اَوراد و وظائف بتلا بتلا کر پیروں نے لوگوں کو برباد کر دیا ہے، ان پیروں کو مُریدین کی اصلاح کی تو فکر نہیں اور صرف وظائف پر تکیہ کئے ہوئے ہیں لوگوں کے اخلاق خراب و برباد ہو گئے اور پھر اس طرح کی تعلیم سے لوگوں پر یہ اثر ہوا کہ لوگ اَوراد و وظائف کو طریق سمجھ بیٹھے اور کیفیات کو مقصود سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، طریق تو اعمال ہیں اور مقصود رضاءِ حق ہے۔

انہی وظائف کے سلسلہ میں فرمایا کہ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ وظائف اور عملیات کی تعلیم سے بعض لوگوں کے عقائد خراب ہو جاتے ہیں، جیسے کوئی صاحب قرض اتارنے کے لئے ایک تعویذ مانگے، اب اس شخص کو کوئی آیت بتلا دی جائے اور اگر قرض نہ ادا ہوا تو اس کے عقیدے میں یہ بات پیدا ہو جائیگی کہ آیت الٰہیہ میں بھی نعوذ باللہ اثر نہیں، اور یہ سب کچھ ان عاملوں کی بدولت ہوتا ہے۔

پھر مزید فرماتے ہیں کہ کج فہم اور بے وقوف آدمی کو کبھی تعویذ وغیرہ

نہیں دینا چاہیے، اگر اثر نہیں ہوا تو سمجھے گا کہ اسماءِ اِلٰہیہ یا کلامِ اِلٰہی میں بھی تاثیر نہیں، حالانکہ اس تاثیر کا نہ وعدہ کیا گیا ہے نہ دعویٰ۔ اور اس سے بڑھ کر اگر اتفاق سے آیت یا حدیث سے کامیابی نہ ہوئی اور معمولی عملیات سے ہوگئی تو اس سے اور عقیدہ میں فساد ہوگا کہ معمولی عملیات کو قرآن و حدیث سے زیادہ بابرکت سمجھے گا۔

حقیقتِ جہاد

پچھلے صفحات میں ہم نے ان اللہ والوں اور متقی لوگوں کا ذِکر کیا ہے جن کی صحبت اور نورانی مجالس میں انسان کے رزائلِ نفسانی ذائل ہوتے ہیں اور وہ اس قابل بن جاتا ہے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا قانون نافِذ کر سکے اور پوری زمین سے اگر برائیوں کو ختم نہ کر سکے تو کم از کم اتنا تو کر لے کہ بدی کو مغلوب اور خیر اور نیکی کو غالب کر دے اور اس منشاءِ ربانی کو پورا کر دے جس منشاء کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل علیہ السلام کو اس دنیا میں بھیجا، اور خصوصاً سید الرسل وخاتم النبییّن ﷺ کو آخری مِشن دے کر اللہ تعالیٰ نے قیامت سے پہلے مبعوث فرمایا، کیوں کہ نہ اب آپؐ کے بعد کوئی نبی ہے اور نہ ہی کوئی امت۔ اس لئے قیامت تک اس امّت مُسلمہ کا یہ فریضہ بنتا ہے کہ وہ اس زمین کو امن کا گہوارہ بنائے، اللہ کے بندوں کو مخلوق کی غلامی سے آزاد کرائے اور انھیں خالق کی غلامی میں لے ائے، شر کو مغلوب کرے اور خیر کو غالب کرے اور عدل و انصاف کا وہ نظام قائم کرے کہ دنیا خود بخود اس آسمانی دین کی طرف کھینچی چلی آئے۔ ایسے باکردار لوگ ایک طرف اپنی ایمانی قوت سے اپنے کردار کی حفاظت کر رہے ہوں تو

دوسری طرف وہ پوری قوت سے اسلامی ریاست کے حدودِ اربعہ کے بھی محافِظ ہوں تاکہ خیر کی اس مضبوط فصیل میں کوئی رخنہ نہ ڈال سکے۔ یہی کام آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ نے کیا اور یہی کام ہمیں کرنا ہے، کیونکہ قوت کے بغیر ہم بھلائی کی تلقین تو کر سکتے ہیں لیکن شر کو مٹا یا مغلوب ہرگز نہیں کر سکتے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ماضی قریب اور دَورِ حاضر کی چند اسلامی تحریکوں سے وہ عظیم مقصد اوجھل ہوگیا اور انھوں نے دانستہ یا نا دانستہ اپنے پروگرام سے اسلام اور مسلمانوں کے غلبے اور شوکت ہی کو نکال دیا، جس کے بغیر نہ فتنے کا ختم ہونا ممکن تھا نہ ہی اسلام کے محاسن ہی اُجاگر ہو سکتے تھے۔ آج ساری دنیا ہم سے یہی تو سوال کرتی ہے کہ اپنا کوئی نمونہ تو پیش کرو جسے دیکھ کر ہم اس بات کے قائل ہو جائیں کہ واقعی وہ جس گھر میں مُقیم ہیں وہ مکڑی کا جالا ہے؟ کیا ان کے اس جواب پر ہم کوئی ایسا نمونہ پیش کر سکیں گے جہاں پر انھیں پھر ایک بار مدینہ مُنورہ کے فِضا کی خوشبو کی مہک آنے لگے۔

ہم چاہتے ہیں کہ مندرجہ ذیل سُطور میں ایک بار پھر ان اتقیاء اور بزرگوں کے کچھ اقوال پیش کریں جنھوں نے اپنی خانقاہیں اسی لئے سجائی تھیں کہ ان میں ایسے افراد تیار کئے جائیں جو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے اہل بھی ہوں اور اس کے لئے اُٹھ کھڑے بھی ہوں۔

سب سے پہلے ہم مُجدّدِ مِلت حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے چند ملفوضات پیش کرینگے۔ ان کی ذات سے کون

ناواقف ہے، جو دین کی سمجھ ان کے حصہ میں آئی تھی، ان سے بعد میں آنے والا کوئی محقق مُستغنی نہیں رہ سکتا، وہ واقعی حکیم الامت تھے۔

فرماتے ہیں کہ بعض لوگ اسلام کے بڑے ہمدرد اور خیر خواہ بنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا، اور کہتے ہیں کہ جہاد کا جو حکم ہے، سو جہاد تلوار ہاتھ میں لے کر لڑنے کو ہی نہیں کہتے اور اسلام نے اس کی تعلیم نہیں دی، کیوں کہ (نعوذ باللہ) یہ ایک وحشیانہ حرکت ہے۔ (حضرت فرماتے ہیں) یہ ہم بھی مانتے ہیں کہ جہاد اسلام پھیلانے کے واسطے نہیں ہے، ورنہ جزیہ مشروع نہ ہوتا، مگر کیا دفع مضرت کے لئے بھی اس کا اختیار کرنا وحشیانہ حرکت ہے؟ اگر اس کا جواب 'ہاں' میں ہے تو سارے عالم کی قومیں اس پر کیوں مُتفق ہیں اور تمام عالَم کا اس پر کیوں عمل چلا آرہا ہے کہ دِفع مُضرت کے لئے سب تلوار اُٹھاتے ہیں، تو پھر اسلام پر یہ اعتراض کیوں ہے بلکہ اس کو تو امرِ فطری کہہ سکتے ہیں۔ سو یہ عجیب بات ہے کہ اگر اسلام ایک بات کہے تو اسکو وحشیانہ حرکت سمجھا جائے اور خود ہی وہ کام کریں تو حرکت انسانیہ سمجھا جائے۔ باوجود اسکے پھر بھی ایسے عقلمند لوگ آجکل بہت موجود ہیں جو اسلام کی دوستی کے پردے میں دشمنی کرتے ہیں، دوست نُما دشمن ایسوں ہی پر صادِق آتا ہے، ایسوں سے کہنا چاہیے کہ ارے تم جہاد کی کیا تحقیقات کروگے؟ تم آج اپنی ہی تحقیق نہ کرسکے۔ (ماخوذ الافاضات الیومیہ مِن افادات القومیہ۔ جلد ہشتم)

مزید کچھ مقامات پر حضرت فرماتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے بغیر

فِتنہ نہیں رُک سکتا' اس لئے ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ آجکل بے پردگی کی زہریلی ہوا چل رہی ہے، بڑی ہی خطرناک چیز کی طرف مخلوق جارہی ہے، اسکے نتائج نہایت ہی خراب نکلیں گے، بے حیائی کا بازار تو پہلے ہی کھلا ہوا تھا، اب بیباکی بھی شروع ہوگئی ہے، اور غضب یہ ہے کہ قرآن وحدیث سے اسپر اِستدلال کرتے ہیں جو سراسر دین کی تحریف ہے، یہ سب بے حیائی کے کرشمے ہیں، بڑے ہی فِسق وفُجور کا زمانہ ہے، چاروں طرف سے دین پر حملے ہورہے ہیں، ہر شخص اِلاّ ماشاء اللہ نفسانیت پر اترا ہوا ہے اور جانوروں کی طرح آزاد ہے۔

اگر حکومت اسلامی ہوتی اور باشاہ عادل اور دیندار ہوتا تو پتہ چل جاتا کہ ایسی باتیں کیسے کرتے ہیں ۔اب اہلِ حکومت ہی کا مذاق یہ ہے، جس سے ہر قسم کی بے حیائیوں کا ارتکاب ہورہا ہے۔ اگر حدودِ شرعیہ جاری ہوتیں تو ان جرائم کی کسی میں ہمت نہ ہوتی، چوری پر ہاتھ کٹتے، زِنا پر رَجم ہوتا، پھر کسی کی کیا ہمت ہوسکتی تھی، اور اب کیا ہے، بے مہار ہیں، جو چاہیں کریں، کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں، معائب محاسن ہورہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا سے خیر وبرکت رخصت ہورہی ہے، آئے دن ارضی وسماوی بلاؤں کا ظہور ہورہا ہے، قحط سالی، خشک سالی، وباءِ ہیضہ، طاعون، غرقابی مُسلّط ہیں، لیکن عبرت پھر بھی نہیں ۔حق تعالیٰ سب کو ہدایت فرمائے اور فہم سلیم عطا فرمائے ۔آمین۔

(ملفوظ نمبر ۹۷: جِلد ہشتم)

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ایک فاضل فلسفی نے یورپ کے شبہ سے متأثر ہوکر مجھ سے پوچھا کہ 'جہاد کیا چیز ہے؟' میں نے کہا کہ 'اشاعت حق ضروری ہے، اس لئے اس کے موانع کا ارتفاع بھی ضروری ہے (یعنی جو چیز اشاعتِ حق میں رکاوٹ بنے اس کو دور کرنا بھی ضروری ہے) اور یہ اس وقت ہوسکتا ہے جبکہ کفار مغلوب ہوکر رہیں۔ اسکی دو صورتیں ہیں یا تو جزیہ دیں، اس سے بھی مغلوب ہی سمجھے جائینگے یا اگر جزیہ نہ دیں تب ان سے قِتال ہوگا، بس یہ جہاد ہے۔ کہنے لگے کہ 'اگر صُلح کرلیں تب بھی مانع مرتفع ہو سکتا ہے؟ (یعنی رُکاوٹ دور ہوسکتی ہے) مَیں نے کہا کہ 'صُلح کرنے سے مغلوب نہ ہونگے، کیوں کہ جب چاہیں گے صُلح توڑ دیں گے۔ سو جو مقصود ہے کہ مغلوب ہوکر رہیں، وہ مقصود صُلح سے حاصل نہیں ہوسکتا'۔ اس جواب سے ان کو بہت تسلّی ہوئی۔

(ملفوظ نمبر ۹۴: جلد ہشتم)

حضرت حکیم الامت تھانویؒ مزید فرماتے ہیں:

اگر قدرت ہے تو تلوار لے کر غلبہ حاصل کرو، منع کون کرتا ہے، اور اگر اس کی قدرت نہیں جیسا کہ ظاہر ہے تو صبر کرو۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ 'اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو' سارا مدار قوت اور قدرت پر ہے، جیسے نماز روزہ فرض ہے، حکومت بھی فرض ہے، لیکن اس وقت جبکہ قدرت ہو، اور عدم

قدرت پر ایسا کرنا اپنے کو ہلاکت میں پھنسانا ہے،
اور کافی قدرت کا نہ ہونا صاف ظاہر ہے اور جتنی
قدرت ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ کسی نے
دیا سلائی جلائی اور اس پر دوسرے نے ہاتھ رکھ دیا تو
بُجھ گئی، ایسی قوت اور قدرت سے کیا کام چل سکتا
ہے۔

(ملفوظ نمبر ۴۶۶، جلد ہشتم)

نوٹ

مندرجہ بالا رائے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ہندوستان میں اس وقت دی تھی جب ہندوستان تقسیم نہیں ہوا تھا، مگر اس حال میں بھی حضرت فرماتے تھے کہ اسلامی ریاست قائم کرنا اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز و روزہ فرض ہے، اگر یہی بات ہے تو پھر مسلمانوں کی ریاست میں یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنا بدرجہ اولیٰ فرض ہوگا۔ امان اللہ۔

ایک اور سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ:

جہاد سے مقصود اسلام کا یہ ہے کہ عالم سے فتنہ فرو
(دور) ہو۔ آیت 'حَتّٰی لَا تَکُونَ فِتْنَةٌ' میں اس
کی تصریح ہے اور فتنہ ختم ہونا موقوف ہے اسلام کے
غلبہ پر اور غلبہ موقوف ہے جہاد یا خوف جہاد پر۔

(ملفوظ نمبر ۴۹۷: جلد ہشتم)

ایک مزید سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ:

آجکل عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قتال مع الکفار جہادِ اصغر ہے اور مجاہدہ نفس جہادِ اکبر ہے۔ گویا کہ قتال مع الکفار کو علی الاطلاق اس مجاہدہ نفس سے جو خلوت میں ہو گھٹا ہوا درجہ ہو سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ صحیح نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ قتال مع الکفار اگر بلا اخلاص ہے تب تو واقع میں وہ مجاہدہ نفس سے درجہ میں کم ہے اور مجاہدہ نفس اس سے افضل ہے، اور ایسے ہی قتال مع الکفار کو جہاد اصغر اور اسکے مقابلہ میں مجاہدہ نفس کو جہادِ اکبر کہا گیا ہے۔ لیکن اگر قتال مع الکفار اخلاص کے ساتھ ہو تو ایسی حالت میں قتال مع الکفار کو جہادِ اصغر کہنا، غیر محققین صوفیہ کا غلو ہے، بلکہ ایسا قتال مع الکفار جہادِ اکبر ہی ہے اور ایسا قتال اس مجاہدہ نفس سے جو خلوت میں ہو افضل ہے، کیونکہ جو قتال مع الکفار اخلاص کے ساتھ ہوگا وہ مجاہدہ نفس کو بھی شامل ہوگا تو ایسے قتال کے اندر دونوں جہادوں کی فضیلت جمع ہو جاویگی۔

(ملفوظ نمبر ۵۱۵: جلد ہشتم)

نوٹ

یہاں پر بعض لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ آجکل نیت میں اخلاص کہاں ہے کہ کوئی جہاد کرے۔ اگر یہی بات ہے تو پھر اخلاص کی تو ہر عمل میں ضرورت ہے پھر اور کام کیوں کئے جاتے ہیں اور کچھ اور لوگ بغیر اخلاص کے قتال میں مشغول ہیں تو حضرت آپ اخلاص سے قِتال شروع فرمادیں۔آپ نے کیوں اتنے بڑے فریضے کو اپنے یہاں شجرہ ممنوعہ قرار دیا ہوا ہے کہ آپ اس کے ذِکر سے ہی خائف ہیں۔ (امان اللہ)

اسی زمانے کے ایک مشہور و معروف بزرگ جنکی بزرگی تمام اہلِ حق کے یہاں مُسلّم ہے، میری مُراد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ہے۔ اپنی شہرہ آفاق کتاب ''قرآنی افادات'' میں زیرِ عُنوان 'اسلام کو اِقتدار کی ضرورت ہے' فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآنی آیت :

'اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ۔

(سورہ الحج :۴۱)

جس کا ترجمہ ہے' یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں حضرت فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ بڑے جامع، وسیع، معنی خیز اور فِکر انگیز ہیں اور تاریخ ان کی حرف بحرف تصدیق کرتی

ہے۔ اللہ تعالیٰ اِرشاد فرماتا ہے ''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں قابو دیں گے، اِن کے قدم کہیں جمائیں گے تو یہ نہیں ہوگا کہ یہ عَیش وعِشرت کریں گے، یہ تعمیرات میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے، یہ بڑے سے بڑے سرمائے جمع کریں گے، ان کا تمدُّن ایک حسین گُلدستہ بن جائے گا، ان کے شہروں میں ہن برستا نظر آئے گا، ہر شخص کے سر پر 'ہُما' کا پرندہ بیٹھا نظر آئے گا، یہ اعلیٰ سے اعلیٰ سواریوں پر بیٹھے نظر آئینگے، ان کے دسترخوان پر الوانِ نعمت چُنے ہونگے، نہیں مایہ نہیں ہوگا بلکہ فتوحات کی تاریخ، کشور کُشائی، جنگ آزمائی کی تاریخ اور انسانی حوصلہ اور عزم کے اِظہار کی تاریخ کے تجربوں کے برخلاف ان کا یہ حال ہوگا کہ اگر ہم ان کو زمین میں ''تمکین'' اِقتِدار عطا کریں گے تو نماز کو برپا کرینگے۔ میں اس کا ترجمہ یہ نہیں کرتا کہ نماز پڑھیں گے، یہاں لفظ 'صلوٰۃ' نہیں ہے بلکہ 'اَقَامُوا الصَّلٰوۃ' ہے یعنی نماز کو زندگی کا جزء اور اس کا لازمہ بنا دینگے، اس کا انتظام و اہتمام کریں گے اس کے لئے جس فضا کے تیار کرنے کی ضرورت ہے، جتنے علم کی ضرورت ہے، جن جگہوں کی ضرورت ہے، ان سب کا اہتمام کرینگے 'اقاموا الصلوٰۃ' کے لفظ میں یہ سب چیزیں آجاتی ہیں۔

اسی طرح 'وآتوا الزکوٰۃ'، زکوٰۃ ادا کرینگے۔ زکوٰۃ کو عام کرینگے اور معروف یعنی نیکی کا حکم کرینگے اور بُرائی سے روکیں گے۔

یہاں پر یہ خیال رہے کہ 'معروف و مُنکر' کے لئے قرآن مجید میں اور احادیث میں 'امر و نہی' کے الفاظ ستعمال کے گئے ہیں، اِستدعا اور درخواست

کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔عربی زبان ایسی تنگ دامن نہیں ہے کہ اس کے اندر صرف 'امرونہی' کے الفاظ ہوں اور دوسرے الفاظ نہ ہوں جن میں تواضع ہے، خوشامد ہے، جن میں اِستدعا ہے، جن میں مُطالبہ ہے، بلکہ اس کے لئے جہاں کہیں بھی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ 'امرونہی' کے ہیں۔

اس مندرجہ بالا آیت میں بھی بعض دوسری آیتوں کی طرح 'امروا' اور 'نہوا' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو نصیحت و دعوت، ترغیب و فہمائش کے الفاظ سے مختلف ہیں 'امرونہی' (حکم و ممانعت) کا منصب ادا کرنے والے کے لئے اس کی قدرت، طاقت اور بالادستی حاصل ہو اور وہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو اور اس کی بات نہ ماننے کی صورت میں عقوبت و نقصان کا خوف ہو۔ اس لئے بھی ایسی جماعت یا امت کو جو اس فرض کو انجام دینے کے لئے پیدا کی گئی ہے، سیاسی اِقتدار اور قوت کی ضرورت ہے۔ اسی لئے 'امرونہی' یعنی 'بھلائی کا حکم کرنا اور بُرائی سے روکنا' اس کام کے لئے طاقت چاہئے۔ 'امرونہی' وہ مقام چاہتے ہیں جہاں سے ہم اعتماد کے ساتھ کہہ سکیں کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ 'امرونہی' میں ایک استعلاء (دباؤ) ہے اور 'امرونہی' میں درخواست کے معنی نہیں۔ 'امرونہی' حکم دینا اور روکنا، اس کے لئے آدمی میں قدرت چاہئے، ایسا مقام اور ایسی بلندی چاہئے، ایسا اعتماد چاہئے اور اس کی ایسی وقعت ہو دلوں میں کہ وہ ''امر'' کرسکے اور ''نہی'' کرسکے (یعنی نیکی کا حکم کرسکے اور بُرائی کو روک

سکے)

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو اِقتدار کی ضرورت ہے کہ وہ ہمیشہ یہی نہ کہے کہ 'اگر ایسا کرلیا جاتا تو اچھا تھا' ہماری درخواست ہے اور ہم آپ کو ترغیب دیتے ہیں' 'ہم تبلیغ کرتے ہیں' (بیشک) اپنی جگہ پر یہ سلسلہ جاری رہیگا۔ لیکن قرآن کا ایک معیار اور میزان ہے، اس میں الفاظ 'امر و نہی' کے ہیں، جن میں مسلمانوں کو ایسی قوت و طاقت حاصل کرنی چاہئے کہ جس مقام پر فائز ہوکر وہ حکم دے سکیں اور روک سکیں۔ اس لئے کہ فطرتِ انسانی تعریف تو کردیتی ہے اور خوش بھی ہو جاتی ہے، لیکن انسانی نسل کی پوری اصلاح اس کے بغیر نہیں ہوسکتی، جس کے نتیجہ میں "اقاموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ وَ امروا بالمعروف وَ نہوا عنِ المنکر" کے الفاظ آئے ہیں۔

پس ضروری بات یہ ہے کہ ایسے لوگ برسرِ اِقتدار آئیں جن کے دل میں خدا کا خوف ہو اور تقویٰ ہو، ان کی سب سے بڑی فکر آخرت کی فکر ہو اور ان کی صِفت یہ ہو کہ

وہ (بندے جن کی تربیت ایسی ہو چکی ہو) کہ اگر ہم ان کو زمین میں تمکین و غلبہ دیں (یعنی وہی اس دنیا کے والی اور حاکم بنادئے جائیں) تو وہ نمازیں قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیکیوں کے احکام جاری کریں اور بُرائیوں سے لوگوں کو روکیں۔ یعنی یہ "اقامت صلوٰۃ و ایتاءِ زکوٰۃ" اور "امر بالمعروف و نَہی عن المنکر" جو ہے، یہ مقصود ہے، ذریعہ نہیں

ہے، اس کے راستہ سے حکومت الٰہی تک نہیں پہنچنا ہے بلکہ حکومتِ الٰہی کے ذریعہ سے اس کی طرف بڑھنا ہے۔اس لئے زیادہ سے زیادہ ماحول سازگار کرنا ہے پھر ان کو رائج کرنا ہے۔

(ماخوذ نبی خاتم ﷺ و دین کامل ص ۹)

میمن اسلامک پبلشرز

















